اصولِ حدیث کی عظیم و مشہور کتاب

تالیف

ابو الفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ

المتوفی ۷۷۴ھ

ترجمہ، تحقیق وحواشی

حافظ زبیر علی زئی

مکتبہ اسلامیہ

اصولِ حدیث کی عظیم و مشہور کتاب

اِختصار عُلوم الحدیث

تالیف

ابو الفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ

المتوفی ۷۷۴ھ

ترجمہ، تحقیق و حواشی

حافظ زبیر علی زئی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------------- اختصار علوم الحدیث

تالیف ---------------- حافظ ابن کثیر

ترجمہ، تحقیق وحواشی ---------------- حافظ زبیر علی زئی

ناشر ---------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------------- اگست 2010ء

قیمت ----------------

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون:042-37244973

بیسمنٹ اٹلس بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ فیصل آباد۔ پاکستان فون:041-2631204, 2034256

مکتبۃ الحدیث حضرو اٹک فون : 057-2310571

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۃ الاختصار

اللہ رب العالمین کے لئے حمد وثنا ہے، جس نے آخری نبی سیدنا محمد ﷺ خاتم النبیین کو قرآن مجید کی آیات اوران کی تبیین (وحیٔ حدیث) کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگ قرآن و حدیث پرعمل پیرا ہوکر دنیا کی کامیابی واُخروی نجات اورنعیم جنت کے حقدار بن جائیں۔

قرآن مجید اپنے الفاظ وحروف کے ساتھ مِن وعَن آج بھی اسی حالت میں محفوظ ہے، جس طرح نازل ہوا تھا اوراحادیث میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اورضعیف ومردود روایات بھی ہیں، جیسا کہ کتبِ حدیث کے ابتدائی طالب علم پر بھی ظاہر ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ .)) اور جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ اپنا ٹھکانا (جہنم کی) آگ میں تلاش کرے۔

(صحیح بخاری:۱۱۰)

خوش قسمت ہے وہ شخص جو کتاب وسنت یعنی قرآن وحدیث پر سلف صالحین کے فہم کی روشنی میں عمل کرے، اجماع کو حجت سمجھے اور ہر وقت صحیح احادیث کی تحقیق وجستجو اوراُن پر عمل کرنے میں کوشاں رہے۔

امام عبداللہ بن المبارک المروزی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''**الإسناد من الدين، ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء**'' سندیں دین میں سے ہیں، اوراگر سندیں نہ ہوتیں تو جس کی جو مرضی ہوتی وہ کہہ دیتا۔ (صحیح مسلم، ترقیم دارالسلام:۳۲ وسندہ صحیح)

علمِ حدیث کے مشہور امام اورامام بخاری کے استاذ امام علی بن المدینی رحمہما اللہ نے فرمایا:

''**التفقه في معاني الحديث نصف العلم و معرفة الرجال نصف العلم**''

حدیث کے معانی میں تفقہ آدھا علم ہے اوراسماء الرجال کی معرفت آدھا علم ہے۔

(المحدث الفاصل للرامہرمزی ص۳۲۰ رقم ۲۲۲ وسندہ صحیح)

دلائلِ مذکورہ اور غیر مذکورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے محدثین کرام نے احادیث کی کتابوں کے مجموعے لکھے، اسماء الرجال کا علم مدوّن کیا اور اصولِ حدیث کی کتابوں کو زیبِ قرطاس کیا۔

ہمارے علم کے مطابق اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کی سب سے پہلی کتاب امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۴ھ) نے (کتاب الرسالہ) لکھی، اُن کے بعد درج ذیل کتابیں لکھی گئیں جیسا کہ نخبۃ الفکر وغیرہ میں مذکور ہے۔

۱: المحدث الفاصل بین الراوی والواعی (تصنیف: قاضی حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد الرامہرمزی)

۲: معرفۃ علوم الحدیث (تصنیف: حاکم نیشاپوری)

۳: المستخرج علیٰ معرفۃ علوم الحدیث (تصنیف: ابونعیم الاصبہانی)

۴: الکفایہ فی علم الروایہ (تصنیف: خطیب بغدادی)

۵: الجامع الآداب الراوی والسامع (ایضاً)

۶: الالماع الیٰ معرفۃ اصول الروایۃ وتقیید السماع (تصنیف: قاضی عیاض مالکی)

۷: علوم الحدیث عرف مقدمہ ابن الصلاح (تصنیف: ابن الصلاح الشافعی)

۸: التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر النذیر (تصنیف: یحییٰ بن شرف النووی)

۹: اختصار علوم الحدیث (تصنیف: حافظ ابن کثیر)

اختصار علوم الحدیث کا ترجمہ، تحقیق اور حواشی زیرِ نظر کتاب کی صورت میں پیشِ خدمت ہے۔ اس کتاب کی بہترین شرح شیخ احمد شاکر مصری رحمہ اللہ نے ''الباعث الحثیث'' کے نام سے لکھی ہے۔

۱۰: تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی (تصنیف: سخاوی صوفی)

۱۱: نظم الدرر فی علم الاثر المعروف: الفیۃ العراقی (تصنیف: عبدالرحیم بن الحسین العراقی)

۱۲: فتح المغیث فی شرح الفیۃ الحدیث (تصنیف: سخاوی صوفی)

۱۳: نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر (تصنیف: حافظ ابن حجر العسقلانی)

۱۴: الموقظہ فی علم مصطلح الحدیث (تصنیف: حافظ ذہبی)

شیخ سلیم بن عید الہلالی نے ''کفایۃ الحفظہ'' کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔

۱۵: المنظومۃ البیقونیہ (تصنیف: عمر بن محمد البیقونی)

۱۶: قواعد التحدیث (تصنیف: جمال الدین القاسمی)

۱۷: تیسیر مصطلح الحدیث (تصنیف: ڈاکٹر محمود الطحان)

اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں اُصولِ حدیث میں لکھی گئی ہیں۔

حافظ ابو الفداء اسماعیل بن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی عظیم الشان کتاب '' اختصار علوم الحدیث'' جو عرب ممالک میں غلط العوام کی وجہ سے '' الباعث الحثیث'' کے نام سے مشہور ہے، علم مصطلح الحدیث کی مشہور اور مستند کتاب ہے۔

راقم الحروف نے یہ کتاب کئی دفعہ پڑھائی ہے اور اب یہ اردو ترجمہ، تحقیقِ روایات و اقوال اور مفید حواشی کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب پر میری محنت کو میرے لئے توشۂ آخرت بنائے اور جن بھائیوں نے اس کی اشاعت میں جو بھی ممکنہ تعاون کیا ہے انھیں دنیا و آخرت میں اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے، خاص طور پر میرے عزیز بھائی حافظ ندیم ظہیر حفظہ اللہ اور برادرم ابو خالد عبد المجید حفظہ اللہ کو دنیا و آخرت میں اجرِ عظیم اور جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اس عظیم کتاب کی تسوید اور پروف ریڈنگ میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ آمین

میرے لئے یہ بات بھی خوشی کا باعث ہے کہ میرے بیٹے معاذ نے اس کتاب کی کمپوزنگ کر کے اس عظیم المرتبت اَمر میں حصہ لیا ہے۔ جزاہ اللہ خیراً

حافظ زبیر علی زئی

(۹/ جون ۲۰۰۹ء)

اختصار علوم الحدیث

اختصارُ علومِ الحدیث

(آغازِ کتاب)

ہمارے اُستاذ امام علامہ ، مفتی الاسلام قدوۃ العلماء شیخ المحدثین ، حافظ مفسر ، بقیۃ السلف الصالحین ، عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الشافعی [1] جو شام کے محفوظ علاقے میں حدیث وتفسیر کے امام الائمہ ہیں ، اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کو وسعتیں عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں انھیں (ابن کثیر کو) اعلیٰ مقصود ومطلوب تک پہنچائے ، نے (اپنی اس کتاب: اختصار علوم الحدیث میں) فرمایا:

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور سلام ہو ان بندوں پر جنھیں اس (اللہ) نے چُن لیا، اما بعد:
نبی ﷺ پر بہترین درود وسلام ہو ، بے شک آپ کی حدیث کے علم پر قدیم وجدید دور میں جماعتِ محدثین مثلاً حاکم (نیشاپوری) اور خطیب (بغدادی) نے اور ان سے پہلے کے اماموں اور بعد والے حفاظِ حدیث نے پوری توجہ سے (تحقیقی) کلام کیا ہے۔

چونکہ علمِ حدیث تمام علوم میں اہم ترین اور نفع بخش ہے لہٰذا میں نے چاہا کہ اس میں ایک مختصر، نفع بخش، جامع اور مانع کتاب لکھوں۔ چونکہ شیخ امام علامہ ابو عمرو بن الصلاح (الشہر زوری) __ اللہ انھیں اپنی رحمت سے ڈھانپ لے __ کی بہترین جمع کردہ کتاب

---

(۱) الشافعی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حافظ ابن کثیر امام شافعی کے مقلد تھے ، انھیں شافعی علماء کے پاس پڑھنے کی وجہ سے ان کے شاگرد نے شافعی لکھ دیا ہے۔ شافعی علماء یہ اعلان کرتے تھے کہ "ہم شافعی کے مقلد نہیں ہیں بلکہ ہماری رائے ان کی رائے کے موافق ہوگئی ہے۔" (دیکھئے التقریر والتحبیر ۳/۴۵۳، تقریرات الرافعی ۱/۱۱، اور النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر ص ۷) اور عالم کیونکر مقلد ہو سکتا ہے؟ جبکہ وہ تقلید کا مخالف بھی ہو، جیسے کہ حافظ ابن کثیر نے تقلید کا رد لکھا ہے۔
دیکھئے تفسیر ابن کثیر (اردو ج۱ ص ۱۱۸) اور نور العینین (ص ۲۷)

(علوم الحدیث/مقدمہ ابن الصلاح) طلبائے حدیث کے نزدیک اس فن کی مشہور کتابوں میں سے ہے۔ بعض ماہر نوجوانوں نے اسے یاد بھی کر رکھا ہے، میں ان (ابن الصلاح) کے نقشِ قدم پر چلا، میں نے اسے مختصر کر دیا جسے انھوں نے پھیلایا تھا، اور جو اُن سے رہ گیا تھا میں نے اضافہ کر دیا۔ انھوں نے استاذِ محدثین ابو عبداللہ الحافظ الحاکم النیسابوری کے نقشِ قدم پر حدیث کی پینسٹھ (۶۵) اقسام ذکر کیں۔

اللہ کے فضل سے میں ان سب اقسام کو ذکر کروں گا اور اس کے ساتھ حافظ کبیر ابو بکر البیہقی کی کتاب " المدخل إلی کتاب السنن " سے بھی اضافہ نقل کروں گا۔ (ان شاء اللہ)

اس کتاب (المدخل للبیہقی) کو میں نے اسی طرح مختصر کیا ہے، اس میں کوئی (فضول) کمی بیشی نہیں ہے۔ اللہ ہی مددگار ہے اور اسی پر بھروسا ہے۔

حدیث کی اقسام کا بیان

(۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف (۴) مُسنَد (۵) متصل (۶) مرفوع (۷) موقوف (۸) مقطوع (۹) مرسَل (۱۰) منقطع (۱۱) مُعضَل (۱۲) مُدلَّس (۱۳) شاذ (۱۴) منکر (۱۵) جس کا شاہد ہو یعنی شواہد (۱۶) زیادتِ ثقہ (۱۷) افراد (۱۸) معلَّل یعنی معلول (۱۹) مضطرب (۲۰) مُدرَج (۲۱) موضوع (۲۲) مقلوب (۲۳) جس کی روایت قبول کی جاتی ہے، اس کی پہچان (۲۴) حدیث سننے سنانے کی کیفیت اور اجازت کے حصول وغیرہ کی پہچان

(۲۵) کتابتِ حدیث اور اس کے ضبط (یاد کرنے) کی پہچان (۲۶) روایتِ حدیث کی کیفیت اور اس کے بیان کی شرائط (۲۷) آدابِ محدث (۲۸) طالبِ علم کے آداب (۲۹) عالی اور نازل کی پہچان (۳۰) مشہور (۳۱) غریب (۳۱) عزیز (۳۲) غریب الحدیث اور اس کی لغت یعنی مشکل الفاظ کی تشریح (۳۳) مسلسل (۳۴) ناسخ ومنسوخ (۳۵) سند ومتن میں تصحیف والی روایت (۳۶) مختلف الحدیث (۳۷) المزید فی متصل الاسانید (۳۸) مرسل خفی (۳۹) معرفتِ صحابہ (۴۰) معرفتِ تابعین (۴۱) اکابر کی اصاغر سے (روایت کی) پہچان (۴۲) مُدَبَّج اور روایتِ اَقران (۴۳) بھائیوں اور بہنوں کی پہچان (۴۴) والدین

کی اولاد سے روایت (۴۵) اولاد کی والدین سے روایت (۴۶) جس سے دو آدمی روایت کریں (ایک) متقدم ہو اور (دوسرا) متاخر (۴۷) جس سے صرف ایک ہی روایت کرے (۴۸) جس کے بہت سے نام اور متعدد (صفتیں) ہوں (۴۹) اسماءِ مفردہ (۵۰) ناموں اور کنیتوں کی پہچان (۵۱) جو کنیت کے بجائے نام سے مشہور ہو (۵۲) معرفتِ القاب (۵۳) المؤتلف والمختلف (۵۴) المتفق والمفترق (۵۵) سابقہ دونوں قسموں سے مرکّب قسم (۵۶) ایک اور قسم (۵۷) جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور (مثلاً ماں) کی طرف منسوب ہو (۵۸) ظاہری وباطنی طور پر انسابِ مختلفہ کی پہچان (۵۹) مُبہمات کی پہچان (۶۰) وفیات کی تاریخ (۶۱) ثقہ اور ضعیف راویوں کی پہچان (۶۲) جو لوگ اپنی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے (۶۳) طبقات کی پہچان (۶۴) علماء اور راویوں میں سے موالی (غلاموں) کی پہچان (۶۵) راویوں کے شہروں اور علاقوں کی پہچان۔

یہ شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) کی بیان کردہ اقسام اور ترتیب ہے۔

انھوں (ابن الصلاح) نے کہا: یہ تقسیم آخری تقسیم نہیں ہے کیونکہ اس کی لاتعداد اقسام ہوسکتی ہیں۔ راویوں کے حالات وصفات اور متونِ حدیث کے احوال وصفات کو منحصر (اور مقیّد) نہیں کیا جاسکتا۔

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: ان ساری اقسام میں نظر ہے بلکہ ان انواع واقسام کو اس طرح پھیلا دینے میں (بھی) نظر ہے کیونکہ ان اقسام کا ایک دوسرے میں مُدغم کر دینا ممکن ہے اور مناسب بھی یہی تھا۔ انھوں (ابن الصلاح) نے ایک دوسرے سے ملی جلی اقسام کو جدا جدا لکھا ہے جب کہ مناسب یہ تھا کہ وہ ہر قسم کو اس کے مناسب مقام پر لکھتے۔

ہم نے اسے مناسب ترین طریقے پر مرتب کیا ہے، اختصار اور مناسبت کے لئے ہم نے بعض اقسام کو باہم مُدغم کر دیا ہے۔

ہم نے جہاں ان (ابن الصلاح) سے اختلاف کیا ہے، ان شاء اللہ اس کی صراحت کر دیں گے۔

۱۔ پہلی قسم: صحیح

[صحت اور ضُعف کے لحاظ سے حدیث کی تقسیم [1]]

(ابن الصلاح نے) کہا: جان لیں! اللہ آپ کو اور مجھے علم عطا فرمائے کہ اہلِ حدیث کے نزدیک حدیث صحیح، حسن اور ضعیف (تین قسموں) میں منقسم ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اگر یہ تقسیم نفسِ امر کی نسبت سے ہے تو حدیث کی دو ہی قسمیں ہیں: صحیح یا ضعیف، اور اگر اصطلاحِ محدثین کے لحاظ سے ہے تو ان کے نزدیک حدیث کی قسمیں اس سے زیادہ ہیں جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اور دوسروں نے (بھی) بیان کیا ہے۔

[صحیح حدیث کی تعریف]

ابن الصلاح نے کہا: صحیح حدیث اس مُسنَد حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند عادل وضابط راویوں کی سند کے ساتھ آخر تک متصل ہو اور شاذ ومعلول نہ ہو۔

پھر انھوں نے اپنی اس تعریف کے فوائد بیان کئے اور اس میں مرسل، منقطع، معضَل، شاذ، جس میں علتِ قادحہ ہو اور جس کے راوی پر جرح ہو، سے احتراز کیا (کیونکہ یہ اقسام صحیح حدیث کی تعریف سے خارج ہیں)

انھوں نے کہا: یہ وہ حدیث ہے جس کے صحیح ہونے پر اہلِ حدیث (محدثین) کے درمیان کوئی اختلاف نہیں (یعنی اجماع) ہے۔

وہ ان اوصاف کے وجود (وعدمِ وجود) اور بعض شرائط مثلاً مرسل (کے قبول) میں اختلاف رکھتے ہیں۔ میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: صحیح حدیث کی تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ یا آخر تک، صحابی یا ان سے نچلے راوی تک متصل سند ہوتی ہے جسے عادل

(۱) تنبیہ: دو بریکٹوں [ ] کے درمیان والی یہ سرخیاں "الباعث الحثیث" سے وضاحت کے لئے لی گئی ہیں۔

ضابط راوی نے عادل ضابط راوی سے آخر تک بیان کیا ہوتا ہے۔ یہ شاذ، مردود اور علتِ قادحہ سے معلول نہیں ہوتی۔ یہ کبھی مشہور ہوتی ہے اور کبھی غریب ہوتی ہے۔

حفاظِ حدیث کی نظر میں اپنے اپنے محل پر مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے بعض حفاظِ حدیث نے بعض سندوں کو اصح الاسانید (صحیح ترین سندیں) قرار دیا ہے:

احمد (بن حنبل) اور اسحاق (بن راہویہ) سے روایت ہے: ''**الزهري عن سالم عن أبيه**'' اصح الاسانید ہے۔[1]

علی بن المدینی اور (عمرو بن علی) الفلاس نے کہا: ''**محمد بن سيرين عن عبيدة عن علي**'' اصح الاسانید ہے۔[2]

یحییٰ بن معین نے کہا: ''**الأعمش عن إبراهيم عن علقمة عن ابن مسعود**'' اصح الاسانید ہے۔[3]

(امام محمد بن اسماعیل) البخاری سے روایت ہے کہ ''**مالك عن نافع عن ابن عمر**''

---

(۱) قول احمد (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۵۴ ح ۹۷/ اس کی سند حسین بن عبداللہ الصیر فی اور محمد بن عباس الدوری الحلبی دونوں کے مجہول الحال ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

قول اسحاق بن راہویہ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۴ وعنہ الخطیب فی الکفایہ ص ۳۹۷، یہ سند ضعیف ہے۔ اس میں محمد بن سلیمان بن خالد الدالانی راوی کی توثیق معلوم نہیں ہے۔)

(۲) قول علی بن المدینی (معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۴، یہ سند ضعیف ہے۔ حسین بن عبداللہ الصیر فی اور محمد بن العباس الدوری دونوں کی توثیق نامعلوم ہے)

قول عمرو بن علی الفلاس (معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۴، یہ قول ثابت نہیں ہے۔ خلف بن محمد الخیام مجروح ہے۔ دیکھئے الارشاد للخلیلی ۳/۹۷۲، ۹۷۳، اور محمد بن حریث البخاری کی توثیق مطلوب ہے)

(۳) قول یحییٰ بن معین (معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۴، یہ سند ضعیف ہے، اس میں حسین بن عبداللہ الصیر فی اور محمد بن العباس الدوری کی توثیق نامعلوم ہے)

اصح الاسانید ہے۔[1]

بعض (ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر التمیمی) نے (اس میں) اضافہ کیا کہ "الشافعي عن مالك (عن نافع عن ابن عمر) "اصح الاسانید ہے، اس لئے کہ وہ (امام شافعی امام) مالک کے شاگردوں میں سب سے زیادہ جلیل القدر ہیں۔[2]

[صحیح حدیثیں سب سے پہلے کس نے جمع کیں؟]

فائدہ: سب سے پہلے (امام) ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری صحیح حدیث جمع کرنے کے لئے متوجہ ہوئے پھر ان کے ساتھی اور شاگرد (امام) ابوالحسین مسلم بن الحجاج النیسابوری اُن کے نقشِ قدم پر چلے اور یہ دو کتابیں (صحیح بخاری و صحیح مسلم) کتبِ حدیث میں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔

بخاری کو زیادہ ترجیح حاصل ہے کیونکہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں روایتِ حدیث کی یہ شرط لگائی ہے کہ راوی اپنے استاد کا معاصر ہو اور اس کا اپنے استاد سے سماع بھی ثابت ہو۔

(امام) مسلم نے دوسری شرط نہیں لگائی بلکہ انھوں نے صرف معاصرت پر ہی اکتفا کیا ہے۔

یہاں سے اس اختلاف کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ حاکم کے استاد ابوعلی النیسابوری[3] اور علمائے مغرب (اندلس و مراکش کے علماء) کے برعکس صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح حاصل ہے جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔

پھر (یاد رکھیں کہ) بخاری و مسلم نے یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ تمام کی تمام صحیح احادیث روایت

---

(۱) الکفایۃ للخطیب (ص ۳۹۸ وسندہ صحیح) السنن الکبریٰ للبیہقی (۲۸۳/۱۰ وسندہ صحیح) معرفۃ علوم الحدیث (ص ۵۳ وسندہ حسن)

(۲) ابومنصور کا یہ قول ابن الملقن نے بغیر کسی حوالے کے المقنع فی علوم الحدیث (۴۶/۱) میں نقل کیا ہے۔!

(۳) ابوعلی النیسابوری کا یہ قول صحیح سند کے ساتھ تاریخ الاسلام للذہبی (۴۲۱/۲۵) اور تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۰۸/۱۶) میں موجود ہے۔

کردیں گے کیونکہ انھوں نے ایسی احادیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے جو اُن دونوں کی کتابوں (صحیح بخاری وصحیح مسلم) میں موجود نہیں ہیں۔ جیسا کہ ترمذی وغیرہ (امام) بخاری سے ایسی احادیث کا صحیح ہونا نقل کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں موجود نہیں ہیں بلکہ سنن (ترمذی وسنن ابی داود) وغیرہ میں موجود ہیں۔[1]

[صحیحین میں احادیث کی تعداد]

ابن الصلاح نے کہا: مکرر روایات کے ساتھ صحیح بخاری کی تمام احادیث کی تعداد سات ہزار دوسو پچھتر (۷۲۷۵) ہے اور تکرار کے بغیر چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔

صحیح مسلم کی تمام روایات کی تعداد، تکرار کے بغیر چار ہزار (۴۰۰۰) ہے۔[2]

[صحیحین پر زیادات]

حافظ ابو عبداللہ محمد بن یعقوب بن الاخرم (النیسابوری) نے کہا: بخاری ومسلم سے بہت

---

(۱) اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حدثنا کے ساتھ روایت کردہ جتنی احادیث ہیں وہ امام بخاری وامام مسلم کے نزدیک صحیح ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کے علاوہ جو صحیح احادیث موجود ہیں وہ امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ بخاری ومسلم نے تمام صحیح حدیثوں کی روایت کے استیعاب کا قطعاً دعویٰ نہیں کیا لہٰذا بعض لوگوں کا بعض حدیثوں پر جرح کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ''بخاری ومسلم نے انھیں روایت نہیں کیا'' یا بعض راویوں پر جرح کردینا کہ ''ان سے بخاری ومسلم نے روایت نہیں لی'' غلط اور مردود ہے۔ ہر وہ روایت صحیح ہے جو جمہور محدثین کے اصول یا تصریح پر صحیح ہو اور اسی طرح ہر وہ راوی ثقہ و حسن الحدیث ہے جسے جمہور محدثین نے ثقہ وحسن الحدیث قرار دیا ہو۔

(۲) فواد عبدالباقی کی ترقیم کے مطابق صحیح بخاری کی تمام روایات کی تعداد ۷۵۶۳ ہے جس میں مکرر روایات بھی شامل ہیں اور صحیح مسلم کی تمام روایات کی تعداد ۳۰۳۳ ہے۔ مکتبہ دارالسلام کی ترقیم کے مطابق صحیح مسلم کی تمام روایات کی تعداد ۷۵۶۳ ہے جس میں مکرر روایات بھی شامل ہیں۔ فواد عبدالباقی کی یہ تقسیم بین الاقوامی طور پر علماء، طلباء اور عوام میں مشہور ہے۔

کم صحیح احادیث رہ گئی ہیں۔ [1]

اس پر ابن الصلاح نے اُن سے (مخالفت) مناقشہ کیا ہے کیونکہ حاکم نے ان دونوں پر بہت سی احادیث میں استدراک کیا ہے، اگر چہ بعض استدراک میں کلام ہے لیکن بہت سی روایتیں (کلام سے بچ کر) بے غبار ہیں۔

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: اس (مناقشے) میں نظر ہے کیونکہ وہ (حاکم) بخاری اور مسلم پر ایسی احادیث کی روایت لازم قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ضعیف راویوں اور معلول ہونے کی وجہ سے لازم نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

بہت سی کتابیں صحیحین پر بطورِ تخریج لکھی گئی ہیں مثلاً:

صحیح ابی عوانہ (الاسفرائنی) صحیح ابی بکر الاسماعیلی (المستخرج) صحیح البرقانی اور صحیح ابی نعیم الاصبہانی (المستخرج) وغیرہ، ان کتابوں میں مفید زیادات (اضافے) اور بہترین سندیں پائی جاتی ہیں۔ دوسری کتابیں جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے مثلاً:

صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان، یہ (حاکم کے) المستدرک سے بہتر ہیں، ان کی سندیں اور متون بھی صاف (وبہترین) ہیں۔ اسی طرح مسند امام احمد میں ایسی بہت سی سندیں اور متون پائے جاتے ہیں جو مسلم بلکہ بخاری (کی روایتوں) کے برابر ہیں اور صحیحین یا کسی ایک میں موجود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو کتبِ اربعہ سنن ابی داود، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں بھی موجود نہیں ہیں۔

اسی طرح طبرانی کی المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں، مسند ابی یعلیٰ (الموصلی) و مسند البزار اور دوسری مسانید، معاجم، فوائد و اجزاء میں ایسی روایات پائی جاتی ہیں جنھیں اس علم (حدیث) کا ماہر راویوں کی تحقیق اور علتِ قادحہ سے سلامتی معلوم کرنے کے بعد صحیح قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ اقدام (صحیح روایت کو صحیح قرار دینا) جائز ہے اگر چہ اس سے پہلے کسی حافظِ حدیث (محدث

(۱) اس قول کا حوالہ یا سند معلوم نہیں ہے۔

وعالم) نے اسے صحیح قرار نہ دیا ہو۔اس میں (ہم نے) شیخ ابوزکریا یحییٰ النووی کی موافقت (کی) ہے اور الشیخ ابوعمرو (بن الصلاح کی) مخالفت (کی) ہے۔

حافظ ضیاء الدین محمد بن عبدالواحد المقدسی نے اس کے بارے میں ایک کتاب ''المختارۃ'' لکھی ہے لیکن یہ مکمل نہیں ہے۔ہمارے اساتذہ میں سے بعض حفاظِ حدیث (ابن تیمیہ) اسے مستدرکِ حاکم پر ترجیح دیتے تھے۔واللہ اعلم

شیخ ابوعمرو بن الصلاح نے مستدرک میں حاکم (کے طریقے) پر کلام کیا ہے، وہ کہتے ہیں: شرطِ صحیح میں حاکم لمبے قدم بھرنے والے اور اس پر حکم لگانے میں متساہل ہیں، بہتر یہ ہے کہ جس حدیث پر (انھوں نے صحیح کا حکم لگایا ہے، اگر اس کی) دوسرے اماموں سے تصحیح نہ ملے تو ان کے بارے میں درمیانہ راستہ اختیار کیا جائے۔ اگر یہ صحیح نہ ہو تو قابلِ حجت حسن (ضرور) ہے، سوائے اس کے کہ اس میں ایسی علت ظاہر ہو جائے جس سے اس روایت کا ضعف لازم آتا ہے۔میں (ابن کثیر) نے کہا: (حاکم کی) اس کتاب میں حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اس میں صحیح روایتیں ہیں جو تھوڑی ہیں، اس میں ایسی صحیح روایتیں بھی ہیں جنھیں بخاری و مسلم نے اپنی کتابوں میں بیان کر رکھا ہے (لیکن) حاکم کو اس کا پتا نہیں چلا۔اس میں حسن، ضعیف اور موضوع روایتیں بھی ہیں۔ ہمارے استاذ (حافظ) ابوعبداللہ الذہبی نے اسے (تلخیص المستدرک میں) مختصر کیا ہے، انھوں نے ان سب روایات (صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع وغیرہ) کو واضح کر دیا ہے۔انھوں نے مستدرک میں پائی جانے والی موضوع روایات پر ایک بڑا جزء لکھا ہے، جو کہ ایک سو احادیث کے قریب ہے۔ واللہ اعلم

[مؤطأ (امام) مالک]

تنبیہ: امام محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ کا قول کہ ''مجھے ایسی کسی علمی کتاب کا علم نہیں ہے جو (امام) مالک کی کتاب سے زیادہ صحیح ہو''[1]

(۱) تقدمۃ الجرح والتعدیل (ص ۱۲) وآداب الشافعی لابن ابی حاتم (ص ۱۵۰) بلفظ: ''مافی الأرض کتاب من العلم أکثر صوابًا من موطأ مالک'' وسندہ صحیح، ورواہ البیہقی فی مناقب الشافعی (۱/ ۵۰۷) نحوہ وسندہ صحیح

انھوں نے یہ قول صحیح بخاری وصحیح مسلم (کے وجود) سے پہلے کہا ہے۔

اس زمانے میں بہت سی کتابیں سنن (احادیث) میں لکھی گئی تھیں۔ ابن جریج، ابن اسحاق (امام المغازی) کی ''السیرۃ'' کے علاوہ کتابیں، ابوقرہ موسیٰ بن طارق الزّبیدی کی کتاب اور مصنف عبدالرزاق بن ہمام وغیرہ، (امام) مالک کی کتاب مُوطأ ان سے جلیل القدر اور عظیم ترین فوائد والی تھی، اگر چہ ان میں سے بعض کتابیں موطأ سے حجم اور کثرتِ احادیث کے لحاظ سے بڑی تھیں۔

(خلیفہ) المنصور نے امام مالک سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ لوگوں کو اُن کی کتاب پر اکٹھا کرنا چاہتے ہیں تو امام مالک نے اسے قبول نہیں کیا، یہ ان کے کمالِ علم اور انصاف سے متصف ہونے کی دلیل ہے۔

امام مالک نے فرمایا: لوگوں نے ایسی چیزیں جمع کی ہیں اور ان روایات پر مطلع ہوئے ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے۔ (۱)

لوگوں نے آپ کی کتاب الموطأ پر پوری توجہ دی اور اس کی (شرح میں) بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سب سے بہترین شیخ ابوعمر بن عبدالبر النَّمر ی القرطبی رحمہ اللہ کی دو کتابیں ''التمہید'' اور ''الاستذکار'' ہیں۔

یہ (کلام) اس کے ساتھ ہے کہ موطأ میں متصل صحیح احادیث (کے علاوہ) مرسل ومنقطع روایات اور ایسی بلاغات ہیں جو کہ بہت کم باسند ملتی ہیں۔

[سنن ترمذی اور سنن نسائی پر لفظِ صحیح کا استعمال؟]

حاکم ابوعبداللہ (النیسابوری) اور خطیب بغدادی دونوں ترمذی کی کتاب کو ''الجامع

(۱) دیکھئے کشف المغطا فی فضل الموطا لابن عساکر (ص ۲۷) والانتقاء لابن عبدالبر (ص ۴۰)
خلیفہ کا امام مالک سے موطأ کے نفاذ کا قصہ صحیح ہے لیکن محمد بن عمر الواقدی (کذاب متروک) کی روایت مردود ہے۔ صاحبِ کتاب نے واقدی کی روایت نقل کر رکھی ہے۔ واللہ اعلم

الصحیح" کہتے تھے اور یہ ان کا تساہل ہے کیونکہ اس میں بہت سی منکر روایتیں ہیں۔ (۱)

حافظ ابو علی بن السکن اور خطیب بغدادی کا سنن نسائی کو صحیح کہنا محلِ نظر ہے اور یہ کہنا کہ ان کی شرطِ صحیح مسلم سے زیادہ سخت ہے، نا قابلِ تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضعیف، معلول اور منکر روایتیں ہیں جیسا کہ ہم نے (اپنی کتاب) الاحکام الکبیر میں تنبیہ کی ہے۔

[مسند امام احمد]

حافظ ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر المدینی کا مسند امام احمد کے بارے میں یہ کہنا کہ "یہ صحیح ہے" [خصائص المسند للمدینی ص ۲۴] ضعیف قول ہے کیونکہ اس (مسند) میں ضعیف بلکہ موضوع روایتیں موجود ہیں جیسے فضائل مرو [مسند احمد ۵/۳۵۷] شہداءِ عسقلان [مسند احمد ۳/۲۲۵] اور حمص کے نزدیک البرث الاحمر (سرخ ہموار زمین) [مسند احمد ۱/۱۹] وغیرہ روایات جیسا کہ حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

مسند احمد کے مقابلے میں کثرتِ روایات اور حسنِ سیاق (بہترین روایات کے لحاظ سے) کوئی مسند نہیں ہے، اس کے باوجود امام احمد سے اس کتاب میں بہت سی حدیثیں رہ گئی ہیں بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں دو سو (۲۰۰) کے قریب صحابہ کی روایات نہیں پہنچیں جن کی روایات صحیحین میں ہیں۔

[کتبِ خمسہ وغیرہ]

اسی طرح حافظ ابو طاہر السِّلَفی کا اصول خمسہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، سنن ترمذی اور سنن النسائی کے بارے میں یہ کہنا کہ "ان کے صحیح ہونے پر علمائے مشرق و مغرب کا اتفاق ہے۔" (۲) ان کا تساہل ہے اور اس کا ابن الصلاح وغیرہ نے رد کیا ہے۔

---

(۱) حاکم نے نسائی پر صحیح کا لفظ مستدرک حدیث صلاۃ التسبیح کے تحت کیا ہے (۱/۳۱۸ ح ۱۱۹۲) حالانکہ حاکم کی ذکر کردہ حدیث سنن نسائی میں موجود نہیں ہے جیسا کہ ابن الملقن نے البدر المنیر میں وضاحت کی ہے۔ خطیب نے نسائی پر صحیح کا اطلاق تاریخ بغداد (۱/۲۴۰ ت ۵۷) میں کیا ہے۔ ابن السکن کے قول کا حوالہ معلوم نہیں ہے۔

(۲) حوالہ معلوم نہیں ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: اور اس کے ساتھ یہ (اصولِ خمسہ) کتبِ مسانید مثلاً مسند عبد بن حمید، مسند (سنن) الدارمی، مسند احمد بن حنبل، مسند ابی یعلیٰ، مسند البزار، مسند ابی داود الطیالسی، مسند حسن بن سفیان، مسند اسحاق بن راہویہ اور مسند عبید اللہ بن موسیٰ وغیرہ سے اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں کیونکہ یہ (مسانید والے) ہر صحابی سے وہ روایت ذکر کر دیتے ہیں جو ان تک پہنچتی ہے۔

[صحیحین کی معلّق روایتیں]

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے صحیح بخاری میں پائی جانے والی معلق روایات پر کلام کیا ہے۔ صحیح مسلم میں بھی معلق روایات ہیں لیکن (بہت) تھوڑی ہیں، کہا جاتا ہے کہ صحیح مسلم میں چودہ (۱۴) معلق روایتیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسے (امام) بخاری نے صیغۂ جزم سے بیان کیا ہے وہ اپنے قائل و فاعل تک (بخاری کے نزدیک) صحیح ہے پھر دوسری روایتوں میں تحقیق کی جاتی ہے، اس میں صیغۂ تمریض سے جو روایتیں ہیں اُن سے نہ صحت معلوم ہوتی ہے اور نہ ضعف لازم آتا ہے کیونکہ ان میں سے بعض روایات صحیح ہیں اور بعض کو (امام) مسلم نے روایت کیا ہے۔

تعلیقات میں سے جو روایتیں صحیح ہیں وہ باسند صحیح کے درجے پر نہیں ہیں کیونکہ انھوں (امام بخاری) نے اپنی کتاب کا نام ''**الجامع المسند الصحیح المختصر في أمور رسول اللہ ﷺ وسننه وأيامه**'' رکھا ہے۔

جب (امام) بخاری: ''اس نے ہمیں بتایا'' یا ''فلاں نے مجھے یہ بتایا'' یا ''مجھے یہ الفاظ زیادہ بیان کئے'' کہیں تو جمہور کے نزدیک یہ متصل (کے حکم میں) ہے۔

ابن الصلاح نے بعض مغربیوں (اہلِ اندلس وغیرہ) سے نقل کیا ہے کہ یہ بھی تعلیق ہے، اسے وہ (امام بخاری) اعتماد کے لئے نہیں بلکہ استشہاد کے لئے نقل کرتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اسے مذاکرے میں سُنا ہو۔

ابن الصلاح نے اس بات کو رد کرتے ہوئے حافظ ابو جعفر (احمد) بن حمدان (بن علی بن

سنان النیسابوری) سے نقل کیا ہے کہ ''جب بخاری وقال لی فلان کہتے ہیں تو وہ انھوں نے بطورِ عرض اور بطورِ مناولہ سُنا ہوتا ہے۔''(۱)

(حافظ) ابن حزم (اندلسی مغربی) نے جب (صحیح بخاری کی) گانے بجانے (کی مذمت) والی حدیث کو رد کیا جس میں امام بخاری نے فرمایا ہے: ''وقال هشام بن عمار'' تو ابن حزم کا رد کرتے ہوئے ابن الصلاح نے کہا:

''ابن حزم کو کئی لحاظ سے غلطی لگی ہے کیونکہ یہ روایت ہشام بن عمار سے ثابت ہے۔''

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: اسے احمد نے اپنی مسند (۳۴۲/۵ ح ۲۲۲۸۸ بسند آخر و متن آخر) ابوداود نے سنن (۴۰۳۹ بسند آخر) برقانی نے اپنی صحیح (المستخرج علیٰ صحیح البخاری) اور کئی محدثین نے متصل سند کے ساتھ ہشام بن عمار اور ان کے استاذ صدقہ بن خالد سے روایت کیا ہے(۲) جیسا کہ ہم نے کتاب الاحکام میں بیان کیا ہے۔ وللّٰه الحمد

پھر (ابن الصلاح نے) بیان کیا کہ (ساری) اُمت نے (ابن الصلاح کے زمانے میں) ان دونوں کتابوں (صحیح بخاری و صحیح مسلم) کو، سوائے چند حروف کے جن پر بعض حفاظِ حدیث مثلاً دارقطنی وغیرہ نے تنقید کی ہے، تلقی بالقبول کا درجہ دیا ہے (قبول کیا ہے۔)

پھر انھوں (ابن الصلاح) نے اس سے یہ استنباط کیا کہ ''صحیحین میں جتنی (حدثنا کے ساتھ بیان کردہ) احادیث ہیں قطعی طور پر صحیح ہیں کیونکہ اُمت (اجماع کی حالت میں) معصوم عن الخطأ ہے لہٰذا جسے اُمت نے صحیح سمجھا اس پر عمل (اور ایمان) واجب ہے اور یہ ضروری ہے کہ یہ روایات حقیقت میں بھی صحیح ہی ہوں۔'' اور یہ استنباط اچھا ہے۔

---

(۱) اسے ذہبی نے بحوالہ حاکم نقل کیا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۳۰۰/۱۴) حاکم سے شیخ الاسلام ابن حمدان تک سند صحیح ہے۔ شیخ کی کتاب جب طالب علم لکھ یا لکھوا کر شیخ پر پیش کر کے ان سے روایتِ حدیث کی اجازت لے لیتا ہے تو اسے عرض کہتے ہیں، شیخ اپنے شاگرد کو جو کتاب دیتا ہے تو اسے مناولہ کہتے ہیں۔

(۲) یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع کی کتاب احادیث ذم الغناء والمعازف فی المیزان ص ۲۲ تا ۳۵

اس مسئلے میں شیخ محیی الدین النووی نے (اپنی کتاب التقریب ص ۴۰ میں) مخالفت کی ہے اور کہا ہے: ''اس سے قطعی الصحت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔''

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: میں اس مسئلے میں ابن الصلاح کے ساتھ ہوں، انھوں نے جو کہا اور راہنمائی کی ہے (وہی صحیح ہے)۔ واللہ اعلم (۱)

حاشیہ: اس کے بعد مجھے ہمارے استاذ علامہ ابن تیمیہ کا کلام ملا جس کا مضمون یہ ہے:

جس حدیث کو (ساری) اُمت کی (بالاجماع) تلقی بالقبول حاصل ہے، اُس کا قطعی الصحت ہونا ائمۂ کرام کی جماعتوں سے منقول ہے۔ اُن میں قاضی عبدالوہاب المالکی، شیخ ابو حامد الاسفرائنی، قاضی ابوالطِیّب الطبری اور شافعیوں میں سے شیخ ابواسحاق الشیرازی، حنابلہ میں سے (ابوعبداللہ الحسن) ابن حامد (البغدادی الوراق) ابو یعلیٰ ابن الفراء، ابوالخطاب، ابن الزاغونی اور ان جیسے دوسرے علماء، حنفیہ میں سے شمس الائمہ السرخسی سے یہی بات منقول ہے (کہ تلقی بالقبول والی احادیث قطعی الصحت ہیں)

ابن تیمیہ نے کہا: ''اشاعرہ (اشعری فرقہ) کے جمہور متکلمین مثلاً ابواسحاق الاسفرائنی اور ابن فُورَک کا یہی قول ہے۔''

انھوں (ابن تیمیہ) نے کہا: ''اور یہی تمام اہلِ حدیث (محدثین کرام اور اُن کے عوام) اور عام سلف صالحین کا مذہب (دین) ہے۔''

یہ بات ابن الصلاح نے بطور استنباط کہی تھی جس میں انھوں نے ان اماموں کی موافقت کی ہے۔ (۲)

---

(۱) اس کی تائید و تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''صحیح بخاری پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' ص ۱۱۔ ۱۸

(۲) معلوم ہوا کہ صحیحین کی احادیث کو ظنی کہنا غلط ہے۔

(۲) دوسری قسم: حسن

جمہور کے نزدیک یہ (الحسن لذاتہ) صحیح کی طرح قابلِ حجت ہے۔

حقیقت میں نہیں بلکہ دیکھنے والے کی نظر میں یہ قسم صحیح اور ضعیف کے درمیان ہے لہٰذا اس فن (علمِ حدیث) کے بہت سے ماہرین پر اس کی تعریف اور ضبط مشکل ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ نسبتی معاملہ ہے، ایک چیز ایک حافظِ حدیث کے نزدیک جرح ہوتی ہے (لیکن) کبھی کبھار اس کی عبارت (اسے بیان کرنے سے) قاصر رہتی ہے۔

بہت سے علماء نے اس کی تعریف بیان کرنے میں بھرپور توانائی صرف کی ہے۔

خطابی نے کہا: جس کا مخرج (سند) معلوم ہو اور اس کے راوی مشہور ہوں۔ (معالم السنن ۱/۱۱)

(ابن الصلاح نے) کہا: اکثر حدیثوں کا دارومدار اسی پر ہے، جمہور علماء اسے قبول کرتے ہیں اور عام فقہاء اسے (اپنے دلائل میں) استعمال کرتے ہیں۔ میں (ابن کثیر) نے کہا: اگر اس کی تعریف ''جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے راوی مشہور ہوں'' ہے تو صحیح حدیث (بھی) اسی طرح ہوتی ہے بلکہ ضعیف بھی اسی طرح ہوتی ہے اور اگر باقی کلام سے تعریف مکمل ہوتی ہے تو یہ کلام کہ اکثر حدیثیں حسن کی قسم سے ہیں، قابلِ قبول نہیں ہے اور نہ اسے اکثر علماء قبول کرتے ہیں اور نہ عام فقہاء اسے استعمال کرتے ہیں۔

[ترمذی کے نزدیک حسن کی تعریف]

ابن الصلاح نے کہا: ہمیں ترمذی سے روایت پہنچی ہے کہ وہ حسن سے یہ مراد لیتے ہیں: ''اس کی سند میں متہم بالکذب راوی نہ ہو، حدیث شاذ نہ ہو اور دوسری سند سے بھی اسی طرح مروی ہو۔'' (ابن کثیر نے کہا:) اگر یہ ترمذی سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے تو کس کتاب میں کہا ہے؟ اور اس کی سند کہاں ہے؟[1] اور اگر انھوں (ابن الصلاح) نے ترمذی

---

(۱) ترمذی کا یہ کلام ان کی کتاب العلل المطبوع مع الجامع ۵/۷۵۸ (وشرح ابن رجب ۱/۳۴۰) میں موجود ہے۔ والحمد للہ

کی کتاب الجامع (السنن) کی اصطلاح سے سمجھا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ بہت سی احادیث کے بارے میں کہتے ہیں: ''یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اسے صرف اسی سند سے ہی جانتے ہیں۔''

[حسن کی دوسری تعریفیں]

شیخ ابو عمرو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے کہا: بعض متاخرین (ابن الجوزی) نے کہا: جس حدیث میں (تھوڑا) ضُعف قابلِ احتمال ہو، وہ حدیث حسن ہے اور اس پر عمل کرنا ٹھیک ہے۔

پھر شیخ (ابن الصلاح) نے کہا: یہ سب چیزیں مبہم ہیں، ان سے تشفی نہیں ہوتی۔ ترمذی اور خطابی نے جو بیان کیا ہے اُس سے حسن کا صحیح سے علیحدہ ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے اس کی بحث و تحقیق میں خوب غور کیا تو مجھ پر صاف واضح ہوا کہ حسن کی دو قسمیں ہیں:

اول: وہ روایت جس کے راویوں میں ایسے مستور ہیں جن کی ثقاہت ثابت نہیں ہے لیکن وہ کثیر الخطأ، غافل اور متہم بالکذب نہیں ہیں۔ اس حدیث کا متن یا مفہوم دوسری سند سے بھی مروی ہے۔ اس طرح یہ روایت شاذ اور منکر کے درجے سے خارج ہے۔

پھر (ابن الصلاح نے) کہا: ترمذی کا کلام اسی پر محمول ہے۔ میں (ابن کثیر) نے کہا: ہم نے جو بیان کر دیا ہے اُس کی وجہ سے اس کلام کو اس پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے۔ واللہ اعلم

دوم: اس کا راوی صدق (سچائی) اور امانت کے ساتھ مشہور ہو اور حفظ واتقان (وثقاہت) میں صحیح حدیث کے راویوں کے درجے تک نہ پہنچا ہو۔ اس کی منفرد روایات کو منکر نہ سمجھا جاتا ہو اور روایت کا متن شاذ یا معلول نہ ہو۔ (ابن الصلاح نے) کہا: خطابی کا کلام اسی پر محمول ہے۔ (ابن الصلاح نے) کہا: ہم نے جو بیان کیا ہے اس سے دونوں (ترمذی و خطابی) کے کلام میں تطبیق ہو جاتی ہے۔[1] شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے کہا:

---

(۱) جس راوی پر بعض محدثین نے جرح کی ہو لیکن جمہور محدثین نے اس کی توثیق کر دی ہو تو ایسے راوی کی متصل روایت حسن لذاتہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ شاذ و معلول نہ ہو اور اس خاص روایت میں راوی کا وہم و خطا کرنا ثابت نہ ہو۔

حدیث کا بہت سی سندوں سے مروی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حسن ہے جیسے کہ "الأذنان من الرأس" (دونوں کان سر میں سے ہیں) والی حدیث ہے کیونکہ ضُعف کے درجے مختلف ہیں، ان سے بعض ضُعف متابعات سے زائل نہیں ہوتا یعنی شدید ضعف والی روایت تابع ہو یا متبوع، اس سے کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے کذابین ومتروکین کی روایات (ہر لحاظ سے مردود ہیں) بعض ضعف متابعت سے زائل ہو جاتا ہے جیسا کہ راوی سيئ الحفظ (بُرے حافظے والا) ہو یا حدیث مرسل مروی ہو تو اس وقت متابعت فائدہ دیتی ہے اور حدیث ضعف کی گہرائیوں سے بلند ہو کر حسن یا صحیح کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ واللہ اعلم

[حسن حدیث کی پہچان میں سنن ترمذی اصل ہے]

(ابن الصلاح نے) کہا: حدیثِ حسن کی پہچان میں سنن الترمذی اصل ہے، انھوں نے ہی اسے مشہور کیا ہے اور یہ (حدیثِ حسن) دوسرے لوگوں (یعنی) ان کے استادوں (اور ان سے پہلے طبقے) مثلاً احمد (بن حنبل)[1] اور بخاری کے کلام میں پائی جاتی ہے اور اسی طرح بعد والے (علماء) مثلاً دارقطنی کے کلام میں یہ موجود ہے۔

[سنن ابی داود حسن حدیث کے مراجع و مآخذ میں سے ہے]

(ابن الصلاح نے) کہا: حسن حدیث کے مراجع و مآخذ میں سے سنن ابی داود (بھی) ہے۔

ہمیں ابو داود سے روایت پہنچی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے اس (کتاب) میں صحیح، ان سے مشابہ اور قریب روایات ذکر کی ہیں۔ جن میں شدید ضعف تھا میں نے اسے بیان کر دیا اور جس کے بارے میں مَیں نے کچھ نہیں کہا وہ صالح ہے، بعض روایتیں دوسری روایتوں سے زیادہ صحیح ہیں۔ (الرسالۃ الی اہل مکۃ لابی داود ص ۲۲)

(ابن الصلاح نے) کہا: اور ابو داود سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے علم کے مطابق ہر

---

(۱) امام احمد بن حنبل امام ترمذی کے استاذ نہیں ہیں، ابن الصلاح نے علوم الحدیث میں کہا ہے: "ويوجد في متفرقاتٍ من كلام بعض مشائخه والطبقة التي قبله كأحمد والبخاري وغيرهما" (ص ۳۲)

باب میں صحیح ترین روایت بیان کردی ہے۔ میں (ابن کثیر) نے کہا: ابوداود سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: اور جس روایت سے میں سکوت کروں تو وہ حسن ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: پس ہم سنن ابی داود میں جو روایت جرح کے بغیر پائیں اور وہ صحیحین میں موجود نہ ہو اور کسی نے اسے صحیح بھی نہ کہا ہو تو وہ ابوداود کے نزدیک حسن ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ابوداود سے سنن کی بہت سی روایات مروی ہیں۔ بعض روایتوں میں ایسا کلام بلکہ احادیث موجود ہیں جو دوسری روایتوں میں نہیں ہیں۔

ابو عبید الآجری (مجہول الحال) نے ایک مفید کتاب لکھی ہے جس میں اس نے جرح و تعدیل اور تصحیح و تضعیف میں ابوداود سے سوالات کئے ہیں۔ ان میں سے حدیثیں اور راوی ہیں جنھیں انھوں نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے پس ان کا قول ''اور میں جس سے سکوت کروں وہ (میرے نزدیک) حسن ہے'' اس سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے صرف سنن ابی داود میں یا مطلقاً سکوت مراد ہے؟ اس کے لئے تنبیہ اور بیداری ضروری ہے۔[1]

[بغوی کی کتاب المصابیح]

(ابن الصلاح نے) کہا: (الحسین بن مسعود) بغوی اپنی کتاب ''المصابیح'' میں جو ذکر کرتے ہیں کہ ''صحیح حدیث وہ ہے جسے بخاری و مسلم یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے روایت کیا ہے اور حسن وہ حدیث ہے جسے ابوداود و ترمذی اور ان جیسوں نے روایت کیا ہے۔'' ان کی خاص اصطلاح ہے جسے ان (بغوی) کے علاوہ کسی دوسرے نے ذکر نہیں کیا ہے۔

نووی نے اس (اصطلاح کی وجہ سے) ان کا رد کیا ہے کیونکہ بعض ایسی روایات منکر ہیں۔

....

(۱) ابن الصلاح کا مذکورہ بالا قول صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ ابوداود کا سکوت حسن ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

[(بظاہر) صحتِ سند سے صحتِ حدیث لازم نہیں ہے]

(ابن الصلاح نے) کہا: کسی سند پر (ظاہر کے لحاظ سے) صحیح یا حسن کا حکم لگانے سے متن پر (صحیح وحسن کا) حکم لازم نہیں آتا کیونکہ یہ متن شاذ یا معلول ہوسکتا ہے۔ (۱)

[ترمذی کا ''حسن صحیح'' کہنا]

(ابن الصلاح نے) کہا: ترمذی کا یہ کہنا ''ھذا حدیث حسن صحیح'' مشکل ہے کیونکہ ان (حالتوں) کا ایک حدیث میں اکٹھا ہوجانا مشکل وناممکن ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ (حسن صحیح) دوسندوں (۱) حسن (۲) صحیح کے لحاظ سے ہے۔!

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: یہ اس لئے مردود ہے کہ ترمذی بعض احادیث کے بارے میں کہتے ہیں: ''یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے، ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔''

بعض کہتے ہیں کہ یہ حدیث متن کے لحاظ سے حسن اور سند کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے۔!

اس میں بھی نظر ہے کیونکہ وہ (ترمذی) صفتِ جہنم، حدود وقصاص وغیرہ والی روایتوں کے بارے میں ایسا کلام کرتے ہیں۔

میرے سامنے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حسن کو صحیح میں اور صحیح کو حسن میں ملا دیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ جس کو ''حسن صحیح'' کہتے ہیں وہ روایت ان کے نزدیک حسن سے بلند اور صحیح سے نیچے ہوتی ہے۔ ان کا کسی حدیث کو محض صحیح کہنا ''حسن صحیح'' کہنے کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے۔ واللہ اعلم

---

(۱) سندِ حدیث پر ماہر محدّث کا ''سندہ صحیح لذاتہ'' یا ''سندہ حسن لذاتہ'' کا حکم لگا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اس حدیث کا متن بھی بالکل صحیح اور موجب عمل وایمان ہے۔ اس حکم سے صرف وہی حدیث مستثنیٰ ہے جس کا شاذ، معلول اور ضعیف ومردود ہونا اُصولِ حدیث اور محدثینِ کرام سے ثابت ہوجائے۔ جس سند میں وجۂ ضعف ہی موجود نہیں ہے تو اس کا صحیح ہونا متن کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ وما علینا إلا البلاغ

(۳) تیسری قسم: ضعیف حدیث

(ابن الصلاح نے) کہا: جس روایت میں (مقبول حدیث) صحیح اور حسن کی سابقہ مذکورہ شرائط جمع نہ ہوں وہ ضعیف حدیث ہوتی ہے۔

پھر انھوں نے ضعیف روایات کی تعداد اور صحیح کی ایک یا اکثر یا ساری شرائط کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی مختلف قسموں پر کلام کیا۔

اس لحاظ سے ضعیف حدیث: موضوع، مقلوب، شاذ، معلّل (معلول)، مضطرب، مرسل، منقطع اور معضل وغیرہ اقسام میں منقسم ہے۔

(۴) چوتھی قسم: مُسنَد

حاکم (نیشاپوری) نے کہا: (مُسند اسے کہتے ہیں) جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو۔ [معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۷]

خطیب (بغدادی) نے کہا: جس کی سند آخر تک متصل ہو۔ [الکفایہ ص ۵۸]

ابن عبدالبر نے کہا: جو روایت رسول اللہ ﷺ سے مروی ہو چاہے متصل ہو یا منقطع (وہ مسند کہلاتی ہے)۔ [التمہید ۱/۲۵] یہ تین اقوال ہیں۔(۱)

(۵) پانچویں قسم: مُتَّصِل

اسے موصول بھی کہا جاتا ہے۔ یہ روایت ارسال اور انقطاع کی نفی کرتی ہے اور وہ تمام روایات اس (کے مفہوم) میں شامل ہیں جو نبی ﷺ تک مرفوع، صحابی پر موقوف یا نچلے راوی (مثلاً تابعی و تبع تابعی) تک (متصلاً) پہنچی ہے۔

....

(۱) ان میں ابن عبدالبر کا قول زیادہ مشہور ہے اور کتبِ مسانید میں اسی پر عمل ہے۔

(۶) چھٹی قسم: مرفوع

جو (روایت) نبی ﷺ کی طرف منسوب کی جائے، چاہے قول ہو یا فعل، متصل ہو یا منقطع ہو یا پھر مرسل ہو (اُسے مرفوع کہتے ہیں۔)

خطیب (بغدادی) نے مرسل کے مرفوع ہونے کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: (مرفوع وہ ہے) جسے رسول اللہ ﷺ سے صحابی بیان کرے۔[1] [الکفایہ ص ۵۸]

(۷) ساتویں قسم: موقوف

بطورِ اطلاق موقوف روایت اُسے کہتے ہیں جو صحابی کے ساتھ ہی خاص ہو۔ صحابہ کے بعد والے لوگوں پر یہ مقیّد (وصراحت) کے بغیر استعمال نہیں ہوتی۔ (مثلاً فلاں نے اسے محمد بن سیرین تابعی پر موقوف کیا ہے۔)

اس کی سند متصل اور غیر متصل (منقطع) ہوتی ہے۔ بہت سے فقہاء اور محدثین اسے اثر کہتے ہیں۔ ابن الصلاح نے خراسانیوں کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ موقوف کو اثر کہتے ہیں۔

(ابن الصلاح نے) کہا: ہمیں ابو القاسم الفورانی (متوفی ۴۶۱ھ) سے روایت پہنچی ہے کہ انھوں نے کہا: جو روایت رسول اللہ ﷺ سے ہو اُسے خبر کہتے ہیں اور جو صحابہ سے ہو اُسے اثر کہتے ہیں۔ میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے جس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار ہوں انھیں بہت سے علماء ''السنن والآثار'' کا نام دیتے ہیں جیسے طحاوی کی السنن والآثار (شرح معانی الآثار) اور بیہقی کی (معرفۃ) السنن والآثار وغیرہ۔ واللہ اعلم

(۸) آٹھویں قسم: مقطوع

یہ تابعین پر موقوف روایت ہوتی ہے چاہے قول ہو یا فعل، یہ منقطع کے علاوہ ہوتی ہے۔

---

(۱) اس میں پہلی تعریف ہی راجح ہے۔ دیکھئے النکت علی ابن الصلاح للحافظ ابن حجر (ج ۱ ص ۵۱۱)

(امام) شافعی اور طبرانی کی عبارتوں میں منقطع غیر متصل سند پر مقطوع کا استعمال کیا گیا ہے۔ شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے یہاں صحابہ کے قول ''ہم اس طرح کرتے تھے'' یا ''ہم یہ کہتے تھے'' پر بحث کی ہے کہ اگر وہ اسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی طرف منسوب نہ کریں تو یہ موقوف کی قسم میں سے ہے۔ اور اگر وہ اسے نبی ﷺ کے زمانے کی طرف منسوب کریں تو ابو بکر البرقانی (متوفی ۴۲۵ھ) نے اپنے استاذ ابو بکر الاسماعیلی سے نقل کیا ہے کہ ''یہ موقوف کی قسم میں سے ہے۔''

حاکم نیشاپوری اسے مرفوع سمجھتے ہیں (معرفۃ علوم الحدیث ص۲۲) کیونکہ یہ تقریر (نبی ﷺ کی طرف سے مقرر کئے جانے) پر دلالت کرتی ہے اور ابن الصلاح نے اسے ہی راجح قرار دیا ہے۔[1] [علوم الحدیث ص۴۴]

(ابن الصلاح نے) کہا: اور اسی میں سے صحابی کا یہ قول: ''ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے'' یا ''لوگ ایسے ہی کرتے تھے'' یا ''ایسا ہی کہتے تھے'' یا ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسا کہا جاتا تھا'' یہ مرفوع کی قسم میں سے ہے۔

صحابی کا یہ کہنا کہ ''ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا'' یا ''ہمیں اس سے منع کیا گیا تھا''

اصحاب الحدیث (محدثینِ کرام) کے نزدیک مرفوع مسند ہے اور اکثر اہلِ علم کا یہی قول ہے۔[2] ایک گروہ نے جس میں ابو بکر الاسماعیلی (بھی) ہیں، نے اس کی مخالفت کی ہے۔

اسی طرح صحابی کا یہ کہنا ''یہ سنت میں سے ہے'' اور (سیدنا) انس (بن مالک رضی اللہ عنہ) کا کہنا کہ ''بلال (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا گیا تھا کہ اذان دوہری اور اقامت اکہری کہیں'' (مرفوع کے حکم میں ہے)[3]

---

(۱) جس روایت میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی صراحت ہو اور کسی صحیح صریح حدیث کے خلاف نہ ہو تو یہ مرفوع حکماً ہے۔ اگر ایسی روایت کسی صحیح حدیث یا مقبول دلیل کے خلاف ہے تو اسے صرف موقوف ہی سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم (۲) اس میں محدثینِ کرام اور اکثر اہلِ علم کا قول ہی راجح ہے۔

(۳) یہ روایت صحیح بخاری: ۶۰۵ و صحیح مسلم: ۳۷۸ میں ہے اور سنن نسائی میں صریح مرفوعاً بھی ثابت ہے۔

(ابن الصلاح نے) کہا: یہ جو کہا جاتا ہے کہ صحابی کی تفسیر مرفوع کے حکم میں ہے، یہ اس وقت ہے جب اس میں (آیت کے) نزول کا سبب وغیرہ بیان کیا گیا ہو۔[1]

اگر صحابی سے روایت کرنے والے (تابعی) "حدیث مرفوع بیان کرتے تھے" یا "ینمیہ" (قائل تک پہنچاتے تھے) یا "نبی ﷺ تک پہنچاتے تھے" کے الفاظ کہے تو اہلِ حدیث (محدثین) کے نزدیک یہ صریح مرفوع کی قسم میں سے ہے۔ واللہ اعلم

(۹) نویں قسم: مرسل

ابن الصلاح نے کہا: اس کی اتفاقی (اجماعی) حالت یہ ہے کہ بڑے تابعی جنھوں نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا اور ان کے پاس بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا جیسے عبیداللہ بن عدی بن الخیار پھر سعید بن المسیب اور ان جیسے دوسرے جب "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:" کہیں (تو یہ مرسل ہے۔)

(ابن الصلاح نے) کہا: مشہور تو یہی ہے کہ (نبی ﷺ سے منقطع روایت میں) تمام تابعین برابر ہیں۔ ابن عبدالبر نے بعض سے نقل کیا ہے کہ وہ چھوٹے تابعین کی مرسل روایتوں کو مرسل نہیں سمجھتے تھے۔

پھر حاکم (نیشاپوری) نے مرسل کو تابعین کے ساتھ مانا ہے اور جمہور فقہاء و علمِ اصول کے ماہرین اسے عام سمجھتے ہیں چاہے تابعین کی مرسل روایت ہو (یا تبع تابعین وغیرہم کی) میں (ابن کثیر) نے کہا: ابوعمرو بن الحاجب (النحوی) نے اپنی کتاب مختصر فی اُصول الفقہ (منتہی الوصول) میں کہا: غیر صحابی جب یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تو اسے مرسل

---

(۱) یہ قول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ تفسیرِ قرآن میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہوا تھا، انھوں نے بہت سی باتیں اجتہاد سے کہی ہیں۔ بعض صحابہ کرام مثلاً سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اہلِ کتاب سے اسرائیلی روایات بھی بیان کی ہیں لہٰذا اس میں تحقیق کرنی چاہیے۔ صحابی کے جس قول میں اجتہاد کا دخل نہ ہو اور یہ قول کتاب وسنت یا مقبول دلیل کے خلاف نہ ہو تو اسے مرفوع حکماً سمجھا جائے گا۔

کہتے ہیں۔(منتہی الوصول ص ۸۸) یہ محدثین (وغیر محدثین) کی تعریفات ہیں۔[1]

رہا دین میں مرسل کا حجت ہونا تو اس کا تعلق علمِ اصول سے ہے اور ہم نے اپنی کتاب ''المقدمات'' میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے۔

(امام) مسلم نے اپنی کتاب (الصحیح) کے مقدمے میں کہا ہے: ''بے شک ہمارے اور علمائے حدیث کے قول میں مرسل حجت نہیں ہے۔'' (صحیح مسلم ۱/۲۰) اور اسی طرح ابن عبدالبر نے اسے اصحاب الحدیث کی جماعت سے نقل کیا ہے۔ (التمہید ۱/۱۷)

ابن الصلاح نے کہا: ہم نے مرسل کے ضعیف اور ساقط از احتجاج ہونے کی بات کہی ہے، اسی پر جماعت حفاظِ حدیث اور ناقدینِ آثار کا اتفاق ہوا ہے اور اسے ہی انھوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔

(ابن الصلاح نے) کہا: اس (مرسل) سے حجت پکڑنا ایک گروہ، مالک، ابوحنیفہ اور ان کے (بعض) ساتھیوں کا قول ہے۔ واللہ اعلم

میں (ابن کثیر) نے کہا: اور اسی طرح کا ایک قول امام احمد بن حنبل سے ایک روایت میں مروی ہے۔[2]

(امام) شافعی نے (مختصر المزنی ۷۸ میں) سعید بن المسیب کی مرسل روایتوں کو حسن قرار دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں (شافعی) نے ان مرسل روایات کی تحقیق کی تو انھیں باسند پالیا۔ واللہ اعلم

---

(۱) راجح یہی ہے کہ تابعی کی رسول اللہ ﷺ سے منقطع روایت کو مرسل کہتے ہیں جبکہ دوسری منقطع روایات کو صرف منقطع وغیرہ کہتے ہیں۔

(۲) مرسل کا مطلقاً حجت ہونا مالک بن انس، ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل سے بھی باسند صحیح ثابت نہیں ہے۔ جو لوگ اسے حجت سمجھتے ہیں ان کی عملاً یہ شرط ہے کہ مرسل روایت ان کی نفسانی خواہشات اور اہواء کے مطابق ہو ورنہ پھر اللہ کی مخلوقات میں مرسل کو سب سے زیادہ ترک کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں۔

کتاب الرسالہ (ص ۴۶۱) میں ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبار تابعین کی مرسل روایات اگر دوسری سند سے آجائیں چاہے یہ سند مرسل ہی ہو یا کسی صحابی یا جمہور علماء کا قول اس کا مؤید ہو یا ارسال کرنے والے (تابعی) جب اپنے استاد کا نام لیں تو صرف ثقہ کا ہی نام لیں۔ اس حالت میں اس کی مرسل حجت ہوتی ہے اور یہ متصل کے درجے تک نہیں پہنچتی۔[1]

شافعی نے کہا: ہمارے علم کے مطابق کسی نے بھی بڑے تابعین کے علاوہ (چھوٹے تابعین کی) مرسل روایات کو قبول نہیں کیا۔

ابن الصلاح نے کہا: مراسیلِ صحابہ جیسے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) اور ان جیسے دوسرے صحابہ کی مرسل روایات متصل کے حکم میں ہیں کیونکہ وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث) صحابہ سے بیان کرتے ہیں اور سارے صحابہ عادل ہیں، ان کا نامعلوم ہونا مضر نہیں ہے۔ واللہ علم

میں (ابن کثیر) نے کہا: بعض نے مراسیلِ صحابہ کے مقبول ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔[2]

ابن الاثیر وغیرہ نے اس کے بارے میں اختلاف نقل کیا ہے۔[3]

یہی مذہب (مسلک) استاذ ابو اسحاق الاسفرائنی سے مروی ہے: اس بات کا احتمال ہے کہ صحابہ نے یہ روایات تابعین سے لی ہوں۔[4]

اکابر نے اصاغر سے اور والدین نے اولاد سے روایتیں لی ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

تنبیہ: حافظ بیہقی اپنی کتاب ''السنن الکبریٰ'' وغیرہ میں اس روایت کو بھی مرسل کہتے ہیں

---

(۱) قول راجح میں مرسل روایت مردود ہوتی ہے چاہے کبار تابعین کی مرسل ہو یا صغار کی۔

(۲) حافظ ابن حجر نے کہا: محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابی کی مرسل روایت متصل کے حکم میں ہے۔ (ہدی الساری ص ۳۵۰)

(۳) ابن اثیر کی طرف اس قول کی نسبت میں نظر ہے۔

(۴) ابو اسحاق الاسفرائنی کی طرف اس قول کی نسبت میں نظر ہے۔ جب تک کوئی قول صاحبِ قول سے اس کی کتاب میں یا با سند صحیح ثابت نہ ہو، مردود کے حکم میں ہوتا ہے۔

جسے کسی تابعی نے (بغیر نام لئے) ایک صحابی سے بیان کیا ہے۔

اگر وہ اس کے ساتھ اسے حجت نہیں سمجھتے تو لازمی طور پر مراسیلِ صحابہ بھی ان کے نزدیک حجت نہیں ہیں۔ واللہ اعلم [1]

(۱۰) دسویں قسم: منقطع

ابن الصلاح نے کہا: اس میں اور مرسل میں فرق کے بارے میں کئی مذاہب (مسالک) ہیں۔

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ سند سے ایک راوی گر جائے یا سند میں ایک مبہم راوی کا اضافہ ہو جائے۔

پہلی بات کی مثال ابن الصلاح نے یہ بیان کی ہے کہ عبدالرزاق نے "عن الثوري عن أبي إسحاق عن زيد بن يُثيع عن حذيفة" کی سند سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "اگر تم ابوبکر کو امیر بنا دو گے..... تو وہ قوی امین ہیں" (معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۸، ۲۹)

کہا: اس میں دو جگہ انقطاع ہے۔

اول: عبدالرزاق نے اسے (سفیان) ثوری سے نہیں سُنا، اُنھوں نے تو اسے نعمان بن ابی شیبہ الجَنَد ی سے روایت کیا ہے (وہ ثوری سے بیان کرتے ہیں)۔

دوم: ثوری نے اسے ابو اسحاق (السَّبیعی) سے نہیں سُنا، وہ تو شریک (بن عبداللہ القاضی)

---

(۱) امام بیہقی کی کتاب القراءۃ خلف الامام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ امام بیہقی "معرفۃ السنن والآثار" (۸۴/۳) میں فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ کے سارے صحابہ ثقہ ہیں لہٰذا ان کا نام معلوم نہ ہونا مضر نہیں ہے۔"

فائدہ: تابعی اگر مدلس نہ ہو تو "عن رجل من أصحاب النبي ﷺ" کہے یا "حدثني رجل من أصحاب النبي ﷺ" کہے، اس کی روایت مقبول ہوتی ہے اور اگر وہ مدلس ہو تو پھر بغیر تصریحِ سماع کے اس کی روایت مقبول نہیں ہے۔

سے (اور وہ ابن اسحاق سے) بیان کرتے ہیں۔[1]

انھوں نے دوسری مثال میں وہ روایت بیان کی ہے جسے ابو العلاء بن عبداللہ بن الشخیر نے "عن رجلین عن شداد بن أوس" کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) "اے میرے اللہ! میں تجھ سے اس معاملے میں ثابت قدمی چاہتا ہوں۔"

(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۲۷ وسندہ ضعیف، فیہ مجہول)

بعض نے کہا ہے کہ منقطع مرسل کی طرح ہے اور ہر وہ روایت (مرسل ہے) جس کی سند متصل نہ ہو الا یہ کہ عام طور پر مرسل اسے کہا جاتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ سے تابعی بیان کرے۔

ابن الصلاح نے کہا: یہ زیادہ قریب (مناسب) ہے، فقہاء کے گروہ اسی پر گامزن ہیں اور خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "الکفایہ" (ص ۲۱) میں اسے ذکر کیا ہے۔

(ابن الصلاح نے) کہا: خطیب نے بعض (ابو بکر البردیجی/ متوفی ۳۰۱ھ) سے نقل کیا ہے کہ تابعی یا بعد کے راوی سے اس کے قول یا فعل کی روایت منقطع کہلاتی ہے۔

یہ (قول) عجیب وغریب ہے۔ واللہ اعلم

(۱۱) گیارھویں قسم: معضل

جس (روایت) کی سند سے (مسلسل) دو یا زیادہ راوی گر جائیں وہ معضل کہلاتی ہے۔ اسی میں سے تبع تابعی کی مرسل روایت ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: اسی میں سے فقہائے مصنفین کا یہ قول ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"

خطیب نے اپنی بعض کتابوں میں اسے مرسل کہا ہے اور یہ اُن کے منہج پر ہے جو ہر غیر متصل (منقطع) روایت کو مرسل کہتے ہیں۔

---

(۱) اس سند میں سفیان ثوری، ابو اسحاق السبیعی اور عبدالرزاق بن ہمام تینوں راوی مدلس ہیں اور مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ بارھویں قسم میں آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ

ابن الصلاح نے کہا: (سلیمان بن مہران) الاعمش نے (عامر بن شراحیل) الشعبی سے بیان کیا: ''قیامت کے دن آدمی کو کہا جائے گا: تُو نے یہ یہ کام کیا تھا؟ (وہ کہے گا:) نہیں، تو اس کے مُنہ پر مہر لگا دی جائے گی۔'' الخ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۳۸ وسندہ ضعیف، الاعمش عنعن)

انھوں (ابن الصلاح) نے کہا: اسے اعمش نے معضل بیان کیا ہے کیونکہ اسے شعبی انس (بن مالک) سے اور وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔ (دیکھئے صحیح مسلم: ۲۹۶۹)

اعمش نے سند سے انس (رضی اللہ عنہ) اور نبی ﷺ کا ذکر حذف کر دیا ہے لہٰذا یہ مناسب ہے کہ اسے معضل کہا جائے۔(۱)

بعض نے یہ کوشش کی ہے کہ معنعن (عن والی) سند پر ارسال یا انقطاع کا اطلاق کریں۔ (اسے مرسل یا منقطع قرار دیں)

صحیح و معمول بہ یہ ہے کہ معنعن روایت متصل اور سماع پر محمول ہوتی ہے بشرطیکہ استاد و شاگرد ایک دوسرے کے معاصر ہوں اور تدلیس کے عیب سے بری ہوں۔

شیخ ابو عمرو الدانی المقریٔ (اور حاکم / دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث ص ۳۴) نے محدثین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے (کہ معنعن روایت ان دو شرطوں کے ساتھ متصل اور سماع پر محمول ہوتی ہے) اور قریب تھا کہ ابن عبدالبر بھی اس پر اجماع کا دعویٰ کرتے۔(۲)

میں (ابن کثیر) نے کہا: اسی پر (امام) مسلم نے اپنی صحیح میں اعتماد کیا ہے اور صحیح مسلم کے مقدمے میں ان لوگوں کا سخت رد کیا ہے جو معاصرت کے ساتھ ملاقات کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ حتیٰ کہ (بعض کے نزدیک) وہ اس سے (امام) بخاری کو مراد لے رہے ہیں اور ظاہر

(۱) اعمش مشہور مدلس ہیں۔ اگر ان کے سماع کی تصریح مل جائے تو عین ممکن ہے کہ شعبی نے بذاتِ خود ایک دفعہ ''عن أنس عن النبي ﷺ'' کی سند سے یہ متن بیان کیا اور دوسری دفعہ اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہوئے یہ متن اپنے الفاظ میں بالجزم بیان کیا لہٰذا اس مثال میں نظر ہے۔

(۲) ابن عبدالبر نے اس معنعن روایت کے مقبول ہونے پر اجماع نقل کیا ہے جس میں تین شرطیں پائی جائیں۔
(۱) راویوں کا ثقہ ہونا (۲) راویوں کی ایک دوسرے سے ملاقات (۳) تدلیس سے براءت

یہ ہے کہ ان (مسلم) کی مراد علی بن المدینی ہیں۔ (مسلم نے بخاری کا نہیں بلکہ ابن المدینی کا رد کیا ہے) کیونکہ وہ (ابن المدینی) صحیح حدیث کی شرط ہی ملاقات قرار دیتے ہیں جبکہ بخاری کے نزدیک صحتِ حدیث کی یہ اصل شرط نہیں لیکن انھوں نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس کا التزام کیا ہے۔[1]

ابوالمظفر السمعانی نے ملاقات کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے پاس لمبا عرصہ رہا ہو۔

ابوعمرو الدانی نے کہا: اگر وہ اپنے استاد سے روایت میں مشہور ہو تو اس کا عنعنہ مقبول ہوگا۔ (علی بن محمد بن خلف المعافری) القابسی نے کہا: اگر اُس نے اپنے استاد کو واضح طریقے سے پایا ہو۔

راوی اگر ''أنّ فلاناً قال'' (بے شک فلاں نے کہا) کہے تو اس میں اماموں کا اختلاف ہے کہ کیا یہ اس کے قول ''عن فلان'' (فلاں سے) کی طرح ہے تاکہ اسے اتصال پر محمول سمجھا جائے اِلا یہ کہ اس کے خلاف ثابت ہو جائے؟ یا اس کا قول ''أنّ فلاناً قال'' اس کے قول ''عن فلان'' سے نچلے درجے کا ہو؟

جیسا کہ احمد بن حنبل، یعقوب بن شیبہ اور ابوبکر البردیجی نے اس میں فرق کیا ہے۔ وہ ''عن'' کو متصل اور ''أنّ فلاناً قال کذا'' کو منقطع کے حکم میں سمجھتے ہیں اِلا یہ کہ اس کے خلاف ثابت ہو جائے۔

جمہور کے نزدیک ''عن فلان'' اور ''أنّ فلاناً قال'' متصل ہونے میں برابر ہیں جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے۔ (دیکھئے التمہید ۱/۱۴)

(امام) مالک بن انس نے بھی یہی صراحت کی ہے۔

---

(۱) حافظ ابن حجر العسقلانی نے اس دعوے کی تردید کی ہے اور بتا دیا ہے کہ امام بخاری اپنی کتاب التاریخ میں بہت سی روایتوں کو عدمِ ملاقات کی وجہ سے معلول قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے النکت علی ابن الصلاح (۵۹۵/۲)

(۱۲) بارہویں قسم: مُدلَّس (تدلیس والی روایت)

تدلیس کی دو قسمیں ہیں:

اول: راوی اُس سے جس سے اس کی ملاقات ہوئی ہے، ایسی روایت بیان کرے جو راوی نے اُس سے نہیں سُنی۔ [اسے تدلیس الاسناد کہتے ہیں۔]

یا اپنے معاصر جس سے اس کی ملاقات نہیں ہے (ایسی روایت بیان کرے جو اُس نے اُس سے نہیں سنی) یہ وہم ڈالتے ہوئے کہ اُس نے یہ روایت اپنے معاصر سے سُنی ہے۔ (۱)

پہلی تعریف کی مثال علی بن خشرم کا یہ قول ہے کہ ہم سفیان بن عیینہ کے پاس تھے، انھوں نے کہا: ''زہری نے یہ کہا'' ان سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اسے زہری سے سُنا ہے؟

انھوں نے کہا: مجھے عبدالرزاق نے ''**عن معمر عن الزهري**'' کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے۔ (۲)

علمائے کرام کی ایک جماعت نے تدلیس کی اس قسم کو مکروہ (حرام) ومذموم قرار دیا ہے۔ اس مسئلے میں (امام) شعبہ سب سے زیادہ (تدلیس کا) رد کرنے والے تھے۔ اُن سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میرے لئے تدلیس کرنے سے زنا زیادہ بہتر ہے یعنی زنا سے تدلیس

---

(۱) اول الذکر کو تدلیس اور ثانی الذکر کو مرسل کہتے ہیں، ثانی الذکر کو تدلیس کہنا غلط ہے۔ تدلیس کی دوسری قسم کے لئے دیکھئے ص ۴۴

(۲) المدخل الی کتاب الاکلیل للحاکم ص ۴۵، ۴۶، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۰۵ ات ۲۴۹، الکفایہ للخطیب ص ۳۵۹ عن الحاکم

اس روایت کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن محمد السکونی (السکری) المروزی کی توثیق نامعلوم ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔

کرنا بڑا جرم ہے۔[1]

ابن الصلاح نے کہا: (شعبہ کا) یہ قول مبالغے اور شدید وعید پر محمول ہے۔

شافعی نے کہا: تدلیس جھوٹ کا بھائی ہے۔[2]

بعض حفاظ حدیث اس تدلیس کی وجہ سے راویوں پر جرح کر کے مطلقاً ان کی روایت رد کر دیتے تھے اگر چہ وہ اتصال والے الفاظ (حدثنا وسمعت وغیرہ) استعمال کریں۔

اور اگر چہ (تدلیس کرنے والے) اس راوی نے صرف ایک دفعہ ہی تدلیس کی ہو جیسا کہ (امام) شافعی رحمہ اللہ نے (کتاب الرسالہ :۱۰۳۳ میں) فرمایا ہے (کہ جس آدمی کا صرف ایک دفعہ تدلیس کرنا ہمیں معلوم ہو جائے تو روایت میں اس کا پردہ چاق ہو گیا یعنی ہم اس کی عن والی روایت قبول نہیں کرتے۔)

ابن الصلاح نے کہا: صحیح یہ ہے کہ مدلس راوی اگر سماع کی تصریح کرے تو اس کی روایت مقبول ہے اور اگر تصریح نہ کرے تو مردود ہے۔

(ابن الصلاح نے) کہا: صحیحین میں اس قسم کے مدلسین مثلاً سفیان بن عیینہ، اعمش، قتادہ اور ہشیم وغیرہم کی بہت سی روایتیں ہیں۔[3]

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: تدلیس کی انتہا یہ ہے کہ مدلس نے اپنے نزدیک ثابت شدہ روایت میں ارسال کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں اپنے استاذ کا نام بتا دوں تو ان کی وجہ سے یہ روایت مردود ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

....

(۱) شعبہ کا یہ قول تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۷۳ پر ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) یہ قول امام شافعی سے ثابت نہیں ہے۔ بیہقی نے مناقب الشافعی ۲/۳۵ میں سخت ضعیف و مردود سند کے ساتھ ایسا قول امام شافعی سے اور انھوں نے شعبہ سے نقل کیا ہے۔

(۳) صحیحین میں مدلسین کی تمام روایات سماع یا متابعات پر مشتمل ہیں۔

دیکھئے تقریب النووی (ص ۹) خزائن السنن (ج ۱ ص ۱)

دوم: اپنے استاد کا نام یا کنیت (جو لوگوں کے درمیان) مشہور ہو، کے خلاف بیان کرنا تا کہ اس کا معاملہ خفیہ رہے اور لوگ اس کے حال پر واقف نہ ہوں۔

[اسے تدلیس الشیوخ کہتے ہیں۔]

تدلیس کا حکم مختلف حالتوں میں مختلف ہے۔ کبھی یہ مکروہ (تنزیہی) ہے جیسا کہ تدلیس کرنے والے کا استاذ اُس سے کم عمر اور لمبی سند والا وغیرہ ہو اور کبھی یہ حرام ہے جیسے کہ اس کا استاد ثقہ نہ ہو پھر یہ تدلیس کرتے ہوئے اُسے سند سے گرائے تا کہ اس کا حال معلوم نہ ہو سکے یا یہ اس (غیر ثقہ) کے ہم نام و ہم کنیت کا دھوکا ڈال دے۔ (۱)

ابوبکر ابن مجاہد المقریٔ نے ابوبکر بن ابی داود (صدوق حسن الحدیث) سے روایت کی تو کہا: ''حدثنا عبداللہ بن ابی عبداللہ'' اور ابوبکر محمد بن حسن النقاش المفسر (کذاب متروک) سے روایت کی تو کہا: ''حدثنا محمد بن سند'' اسے اس کے ایک دادے کی طرف منسوب کر دیا۔ واللہ اعلم

ابوعمرو بن الصلاح نے کہا: ''تدلیس کی اس قسم (تدلیس الشیوخ) کے خطیب (بغدادی) اپنی کتابوں میں بہت دلدادہ و فریفتہ تھے۔'' (۲)

---

(۱) عطیہ العوفی (ضعیف راوی) اپنے استاذ (ابوسعید محمد بن السائب الکلبی (کذاب) سے روایت کرتے ہوئے ''عن أبي سعيد'' یا ''حدثني أبو سعيد'' کہہ کر روایت کرتے ہوئے یہ دھوکا دیتا تھا کہ وہ سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کر رہا ہے۔ یہ تدلیس حرام اور بہت بڑا افراڈ ہے۔ یاد رہے کہ عطیہ اگر عن ابی سعید کے ساتھ الخدری کی صراحت بھی کر دے تو اس سے الکلبی ہی مراد ہے، سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ مراد نہیں ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب المجروحین لابن حبان (۱۷۶/۲)

(۲) خطیب اپنی کتابوں میں ابو القاسم الازہری، عبید اللہ بن ابی الفتح الفارسی اور عبید اللہ بن احمد بن عثمان الصیرفی سے بیان کرتے ہیں یہ نام تین اور شخص ایک ہی ہے۔ اسی طرح وہ الحسن بن محمد الخلال، حسن بن ابی طالب اور ابو محمد الخلال سے بیان کرتے ہیں، یہ ایک ہی شخص ہے۔ خطیب ابو القاسم التنوخی، علی بن المحسن اور علی بن ابی علی المعدل سے بیان کرتے ہیں اور یہ بھی ایک ہی شخص ہے۔ ابن جوزی، بیہقی، ابو نعیم الاصبہانی وغیرہم بھی ایسی تدلیس کرتے تھے۔ تدلیسِ شیوخ کرنے والوں کو تدلیسِ اسناد کرنے والوں میں ذکر کرنا صحیح نہیں ہے۔]

(۱۳) تیرھویں قسم: شاذ

(امام) شافعی نے کہا: شاذ اسے کہتے ہیں جو ثقہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جس میں لوگوں کی مخالفت کرے، رہی وہ روایت جو ثقہ راوی بیان کرے اور دوسرے اسے بیان نہ کریں تو اسے شاذ نہیں کہتے۔ (۱)

حافظ ابو یعلیٰ الخلیلی القزوینی (متوفی ۴۴۶ھ) نے اسے علمائے حجاز کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ (۲)

اگر شاذ بیان کرنے والا ثقہ ہو تو اس روایت میں توقف کیا جاتا ہے اور اس سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ اگر شاذ بیان کرنے والا غیر ثقہ ہو تو اس کی روایت کو رد کر دیا جاتا ہے۔ (۳)

حاکم نیشاپوری نے کہا: شاذ اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ثقہ منفرد ہو اور اس کا کوئی متابع (متابعت کرنے والا) نہ ہو۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۱۹، نیز دیکھئے المستدرک ۱/۳۵)

ابن الصلاح نے کہا: اس پر حدیث ((الأعمال بالنیات)) [اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے] سے اشکال وارد ہوتا ہے کیونکہ اسے صرف (سیدنا) عمر (رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا ہے، اُن سے صرف علقمہ (بن وقاص اللیثی) نے، اُن سے صرف محمد بن ابراہیم التیمی نے اور ان سے صرف یحییٰ بن سعید الانصاری نے بیان کیا ہے۔

(دیکھئے صحیح البخاری: ۱، ۵۴، ۲۳۹۲، ۳۶۸۵، ۴۷۸۳، ۶۵۵۳ و صحیح مسلم: ۱۹۰۷)

میں (ابن کثیر) نے کہا: پھر یہ روایت یحییٰ بن سعید (الانصاری) سے متواتر ہے، کہا جاتا ہے کہ ان سے اسے دو سو یا اس سے بھی زیادہ راویوں نے بیان کیا ہے۔

---

(۱) آداب الشافعی لابن ابی حاتم ص ۱۷۸، ۱۷۹، وسندہ صحیح، معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۱۹ ت ۲۹۰ وسندہ حسن، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی ۱/۸۱، ۸۲

(۲) دیکھئے الارشاد فی معرفۃ علماء البلاد (۱/۱۷۶) اور (خلیلی نے) کہا: حفاظ حدیث اس (مسلک) پر ہیں کہ شاذ اسے کہتے ہیں جس کی ایک سند ہو چاہے شاذ (منفرد) بیان کرنے والا ثقہ ہو یا غیر ثقہ۔

(۳) خلیلی وغیرہ کا یہ قول مردود ہے اور صحیح وہی ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

ابن مندہ نے اس کی غریب اور غیر صحیح متابعات ذکر کی ہیں جیسا کہ ہم نے تفصیل سے "مسند عمر" (مسند الفاروق ۱/ ۱۰۳-۱۰۸) اور "الاحکام الکبیر" میں لکھا ہے۔[1]

(ابن الصلاح نے) کہا: اسی طرح عبداللہ بن دینار کی (سیدنا) عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے ولاء (غلام کے حقِ ملکیت اور رشتہ داری کے تعلق) کو بیچنے یا ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۲۵۳۵، ۶۷۵۶ و صحیح مسلم: ۱۵۰۶)

اور (امام) مالک نے "الزهري عن أنس" کی سند سے منفرداً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور آپ کے سر پر (لوہے کا) خود تھا، یعنی آپ بغیر احرام کے مکے میں داخل ہوئے۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۱۸۴۶، ۳۰۴۴، ۴۲۸۶، ۵۸۰۸ و صحیح مسلم: ۱۳۵۷)

یہ تینوں احادیث صحیحین میں انھی سندوں سے ہیں۔

(امام) مسلم نے فرمایا: زہری نے نوے (۹۰) ایسی (بہترین سندوں والی) روایتیں بیان کی ہیں جنھیں کسی دوسرے نے بیان نہیں کیا۔ (دیکھئے صحیح مسلم: ۱۶۴۷، دارالسلام: ۴۲۶۱)

(امام) مسلم نے (امام) زہری کی منفرد روایات کے بارے میں جو بات کہی ہے ایسی منفرد روایات دوسرے (ثقہ) راویوں نے بھی بیان کی ہیں لہٰذا شروع میں (امام) شافعی کی بیان کردہ بات ہی صحیح ہے۔ اگر ایک ثقہ راوی ایسی روایت بیان کرے جس میں (ہر لحاظ سے) وہ لوگوں کی مخالفت کرے (تطبیق وجمع ممکن نہ ہو) تو یہ روایت شاذ یعنی مردود ہے۔ اس باب سے وہ روایت نہیں جو ثقہ بیان کرے اور دوسرے بیان نہ کریں بلکہ اگر راوی عادل ضابط حافظ (ثقہ) ہو (یا صدوق حسن الحدیث راوی ہو) تو یہ مقبول ہوتی ہے۔ اگر اسے رد کر دیا جائے تو اس قسم کی بہت سی روایتیں رد ہو جاتی ہیں اور بہت سے مسائل دلائل سے خالی ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم

اگر تفرد کرنے والا حافظ نہ ہو مگر عادل ضابط ہو (صدوق حسن الحدیث ہو، جمہور نے اسے موثق قرار دیا ہو) تو اس کی روایت حسن ہوتی ہے اور اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو پھر یہ روایت مردود ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

(۱) ہمارے علم کے مطابق الاحکام الکبیر مفقود کتابوں میں سے ہے۔ واللہ اعلم

(۱۴) چودہویں قسم: منکر

یہ شاذ کی طرح (مردود) ہوتی ہے۔ اگر اس کا (ضعیف) راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرے تو منکر مردود ہوتی ہے اور اسی طرح اگر راوی عادل ضابط نہ ہو (بلکہ ضعیف و مجروح ہو) اور ثقہ راویوں کی مخالفت نہ کرے تو (بھی) منکر مردود ہوتی ہے۔

اگر تفرد کرنے والا راوی عادل ضابط حافظ (ثقہ) ہو تو شرعاً یہ مقبول روایت ہے، اسے منکر نہیں کہا جاتا اگرچہ لغوی طور پر اسے منکر کہا جا سکتا ہے۔

(۱۵) پندرہویں قسم: اعتبار، متابعات اور شواہد

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر حماد بن سلمہ "عن أیوب عن محمد بن سیرین عن أبي هریرة عن النبي ﷺ" کی سند سے ایک حدیث بیان کریں۔ اب اگر اسے حماد کے علاوہ کوئی دوسرا راوی ایوب (سختیانی) سے یا ایوب کے علاوہ دوسرا راوی محمد (بن سیرین) سے یا محمد (بن سیرین) کے علاوہ کوئی دوسرا راوی (سیدنا) ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے یا (سیدنا) ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے علاوہ کوئی دوسرا راوی نبی ﷺ سے روایت کرے تو اسے متابعت کہتے ہیں۔[1]

اور اگر اسی روایت کے ہم معنی روایت کسی دوسرے صحابی سے مروی ہو تو اسے شاہد کہتے ہیں۔

اگر اس مفہوم کی دوسری روایت مروی نہ ہو تو اسے افراد میں سے فرد (مطلق) کہتے ہیں۔

شواہد و متابعات میں اس ضعیف راوی سے درگزر کیا جاتا ہے جس کا ضعف شدید نہ ہو۔ جبکہ اصول (والی روایتوں) میں یہ درگزر نہیں کیا جاتا جیسا کہ صحیحین وغیرہ میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

اسی لئے بعض ضعیف راویوں کے بارے میں (امام) دارقطنی فرماتے ہیں: "یہ اعتبار (شواہد و متابعات) کے لائق راوی ہے" اور "یہ اعتبار کے لائق راوی نہیں ہے۔" واللہ اعلم

---

(۱) شواہد اور متابعات تلاش کرنے کے عمل کو اعتبار کہتے ہیں۔

(۱۶) سولھویں قسم: اَفراد (منفرد روایات)

اس کی (کئی) قسمیں ہیں:

بعض اوقات راوی اپنے استاذ سے (روایت کرنے میں) منفرد (اکیلا) ہوتا ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ یا کسی روایت کے ساتھ کسی علاقے والے منفرد ہوتے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے: اس (روایت) کے ساتھ اہلِ شام یا اہلِ عراق یا اہلِ حجاز منفرد ہیں، وغیرہ

اور بعض اوقات ان (علاقے والوں) میں سے ایک آدمی منفرد ہوتا ہے تو اس طرح دو صفتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

حافظ دارقطنی نے سو (۱۰۰) اجزاء میں افراد کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس کی کوئی مثال ان سے پہلے نہیں ملتی۔ حافظ محمد بن طاہر (المقدسی) نے اسے ''اطراف'' میں مرتب کر دیا ہے۔[1]

(۱۷) سترہویں قسم: زیادتِ ثقہ (کے بارے) میں

جب کوئی (ثقہ) راوی اپنے استاذ سے دوسرے راویوں کی بنسبت منفرد ہو جائے تو اسے زیادتِ ثقہ کہا جاتا ہے۔ کیا یہ مقبول ہے یا نہیں؟ اس میں مشہور اختلاف ہے۔ خطیب (بغدادی) نے اکثر فقہاء سے نقل کیا ہے کہ یہ مقبول ہے[2] اور اکثر محدثین نے اسے رد کر دیا ہے۔[3] بعض لوگ کہتے ہیں: اگر مجلسِ سماع ایک ہو تو قابلِ قبول نہیں ہے اور اگر کئی

(۱) المقدسی کی یہ کتاب ''اطراف الغرائب والافراد'' کے نام سے دو بڑی جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ والحمدللہ

(۲) الکفایہ ص۴۲۴ (۳) حافظ ابن کثیر کی یہ بات محلِ نظر ہے کیونکہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے: جمہور فقہاء اور اصحاب الحدیث نے کہا: ثقہ کی زیادت مقبول ہے، جس کے ساتھ وہ منفرد ہو..... الخ (الکفایہ ص۴۲۴) نیز دیکھئے الباعث الحثیث مع تعلیق الالبانی (۱/۱۹۴) اور المقنع فی علوم الحدیث لابن الملقن (۱/۱۹۱)

مجلسیں ہوں تو قابلِ قبول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ روایت بیان کرنے والے (اصل راوی) کے علاوہ دوسرے کی زیادت مقبول ہے۔ برخلاف اس کے کہ وہ (اصل راوی) کبھی اسے (زیادت کو) بیان کرے اور کبھی اسے بیان نہ کرے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اگر یہ روایت حکم میں دوسرے راویوں کے (سراسر) خلاف ہوتو مقبول نہیں ہے ورنہ مقبول ہے جیسے کہ اگر کوئی راوی ساری حدیث کے ساتھ منفرد (اکیلا) ہوتو اس کا تفرد مقبول ہوتا ہے بشرطیکہ وہ ثقہ ضابط یا حافظ ہو۔

خطیب نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۴۲۵)

شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے زیادتِ ثقہ کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ (امام) مالک نے نافع سے انھوں نے ابن عمر سے روایت کیا: رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر آزاد یا غلام (اور) مرد یا عورت پر رمضان میں صدقۂ فطر فرض قرار دیا ہے۔ (دیکھئے الموطأ ۱/۲۹۴) اس میں ''مسلمانوں میں سے'' (من المسلمین) کے الفاظ (امام) مالک کی نافع سے زیادت ہے۔ ترمذی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ (حفاظِ حدیث میں سے) مالک اس کے ساتھ منفرد ہیں۔ (دیکھئے کتاب العلل الصغیر للترمذی مع السنن طبع دارالسلام ص ۸۹۹، سنن الترمذی: ۶۷۶)

اور ابوعمرو (ابن الصلاح) اس پر خاموش رہے ہیں۔ (حالانکہ امام) مالک نے ان الفاظ کے ساتھ تفرد نہیں کیا بلکہ (امام) مسلم نے اسے مالک کی طرح ضحاک بن عثمان عن نافع کی سند سے بیان کیا ہے۔ (صحیح مسلم: ۹۸۴) اسی طرح بخاری (۱۴۳۲) ابوداود (۱۶۱۲) اور نسائی (۲۵۰۶) نے اسے عمر بن نافع عن ابیہ کی سند سے بیان کیا ہے۔[1]

(ابن الصلاح نے) کہا: اس کی مثالوں میں سے وہ حدیث (بھی) ہے جس میں آیا ہے:

''میرے لئے زمین: مسجد اور پاک (کرنے والی) قرار دی گئی ہے۔''

ابومالک سعد بن طارق الاشجعی نے ''عن ربعي بن حراش عن حذيفة عن النبي

....

(۱) اسے یونس بن یزید اور کثیر بن فرقد وغیرہما نے بھی نافع سے بیان کیا ہے لہٰذا یہ مثال صحیح نہیں ہے۔

علیہ وسلم" کی سند سے اس میں "وتربتھا طھور" اور اس کی مٹی پاک کرنے والی ہے/ کا اضافہ بیان کیا ہے۔ اسے مسلم (۵۲۲) ابن خزیمہ (۲۶۴) اور ابو عوانہ الاسفرائنی (۳۰۳/۱) نے روایت کیا ہے۔

اور (ابن الصلاح نے) ذکر کیا کہ متصل و مرسل کے درمیان اختلاف زیادتِ ثقہ کے قبول کے درمیان اختلاف کے علاوہ ہے۔ [متصل اور مرسل کے درمیان اختلاف اسی طرح ہے جس طرح زیادتِ ثقہ کے مقبول ہونے میں اختلاف ہے/ من نسخۃ أ] (۱)

(۱۸) اٹھارویں قسم: معلل (معلول) حدیث

یہ فن (علم کی ایک قسم) بہت سے علمائے حدیث پر مخفی ہے حتیٰ کہ بعض حفاظِ حدیث نے کہا: اس علم کے ساتھ ہماری معرفت، جاہل کے نزدیک کہانت (کاہنوں نجومیوں کا کام) ہے۔ (۲)

اس فن کی تحقیق کی سعادت ان ماہر نقادِ حدیث کو حاصل ہے جو صحیح اور ضعیف، ٹیڑھی اور مستقیم میں فرق کرتے ہیں جیسے صاحبِ بصیرت جوہری اپنے علم کے ذریعے سے اصلی اور جعلی، دیناروں اور ٹیڈی پیسوں میں فرق کرتا ہے، جس طرح اسے اس فیصلے میں شک نہیں ہوتا اسی طرح اسے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے (کہ وہ روایت معلول ہے اور یہ معلول نہیں

(۱) زیادتِ ثقہ کے مسئلے میں راجح یہی ہے کہ ثقہ کی زیادت (اگر ثقات یا اوثق کے سراسر منافی نہ ہو کہ تطبیق و توفیق ممکن نہ ہو تو) مقبول و معتبر ہے۔

(۲) علل الحدیث لابن ابی حاتم (۹/۱) عن عبدالرحمٰن بن مہدی بلفظ: "انکارنا الحدیث عند الجھال کھانۃ" اس کی سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے جبکہ یہ ثابت ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے معرفۃ الحدیث (حدیث کی پہچان) کو الہام قرار دیا ہے۔ (علل الحدیث ۱۰/۱ وسندہ صحیح)

اس الہام اور کہانت سے مراد ماہر محدثین کا وہ پیشہ ورانہ تجربہ ہے جس کی بدولت وہ علتِ قادحہ وعلتِ خفیہ کو دریافت کر کے بظاہر صحیح نظر آنے والی حدیث کو ضعیف و معلول قرار دیتے ہیں۔ اس سے صوفیوں اور مبتدعین کا خیالی و باطل الہام مراد نہیں جس کے ذریعے سے یہ لوگ غیب کی خبریں دریافت کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں۔! خلاصہ یہ کہ حدیث کے صحیح و ضعیف ہونے کا دارومدار محدثین کرام اور اصولِ حدیث پر ہے۔

ہے۔) بعض لوگ گمان کرتے ہیں اور بعض اپنے علوم، مہارت، طریقِ حدیث پر واقفیت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مٹھاس کے ذوق پر توقف کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام عام لوگوں کے کلام سے مشابہ نہیں ہے۔

بعض مروی احادیث پر انوارِ نبوت ہوتے ہیں اور بعض میں الفاظ کی تبدیلی، باطل زیادت، اوٹ پٹانگ بے تکی بات یا اس جیسے دوسرے الفاظ پائے جاتے ہیں جنھیں اس فن کا ماہر پہچان لیتا ہے۔ بعض اوقات سندوں (کے جمع کرنے) سے علت معلوم ہو جاتی ہے۔

اس کی مثالیں بیان کرنے سے کتاب بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی، یہ تو عملی تجربے سے معلوم ہوتا ہے۔

اس علم میں سب سے جلیل القدر اور عظیم کتاب، امام بخاری کے اور اس فن (علل الحدیث) میں بعد والے تمام محدثین کے استاذ (امام) علی بن المدینی کی کتاب ''العلل'' ہے۔ (۱)

اس طرح عبدالرحمٰن بن ابی حاتم (الرازی) کی کتاب العلل ابواب پر مرتب ہے (۲) اور اسی طرح خلال کی کتاب العلل ہے۔

مسندِ حافظ ابی بکر البزار کی کتاب میں بہت سی علتوں (اور معلول روایتوں) کا ذکر ہے جو دوسری مسندوں میں نہیں پائی جاتیں۔ (۳)

ان سب (معلل) روایتوں کو حافظ کبیر ابوالحسن الدارقطنی نے اپنی کتاب (**العلل الواردة في الأحاديث النبوية**) میں اکٹھا کر دیا ہے اور یہ کتاب سب سے جلیل القدر بلکہ ہم نے جتنی کتابیں دیکھی ہیں اُن میں سے اس فن کی سب سے جلیل القدر کتاب ہے۔ ایسی کتاب ان (دارقطنی) سے پہلے کسی نے نہیں لکھی اور بعد میں آنے والے ایسی کتاب لکھنے سے

---

(۱) امام ابن المدینی کی کتاب العلل کا ایک حصہ مطبوع ہے۔

(۲) علل الحدیث لابن ابی حاتم بھی دو جلدوں میں بغیر تحقیق کے اور تین جلدوں میں مع تحقیق مطبوع ہے۔

(۳) اسے البحر الزخار کہتے ہیں اور یہ کتاب چھپ رہی ہے۔ ہمارے پاس اس کی پندرہ جلدیں موجود ہیں۔

عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ (امام) دارقطنی پر رحم کرے اور انھیں بہترین ٹھکانا (جنت) عطا فرمائے۔

لیکن ایک ضروری چیز کا اس کتاب میں فقدان ہے وہ یہ کہ طالب علموں کی آسانی کے لئے اسے ابواب پر مرتب کرنا چاہئے یا اس کتاب میں مذکور صحابہ کرام کے ناموں کو حروفِ تہجی پر اکٹھا کر دیا جائے تا کہ اس سے استفادہ کرنا آسان ہو جائے۔

اس کی روایتیں سخت بکھری ہوئی ہیں اور انسان اپنی مطلوبہ روایت تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتا اور اللہ توفیق دینے والا ہے۔ (۱)

(۱۹) انیسویں قسم: مضطرب

یہ (مضطرب) اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک معین (خاص و متعین) شیخ پر راویوں کا اختلاف ہوتا ہے یا ایک جیسی برابر بہت سی وجوہ (اسانید و متون) کا اختلاف ہوتا ہے جس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

بعض اوقات اضطراب سند میں ہوتا ہے اور بعض اوقات متن میں ہوتا ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا ذکر طوالت کا باعث ہے۔ واللہ اعلم (۲)

---

(۱) امام دارقطنی کی عظیم الشان کتاب العلل تحقیق اور مفید فہرستوں کے ساتھ سولہ (۱۶) جلدوں میں مکمل چھپ چکی ہے۔ والحمدللہ

(۲) مثلاً ایک روایت میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے گھوڑوں کے گوشت سے منع فرمایا ہے۔ اس روایت کے بارے میں امام دارقطنی نے کہا: ''وھذا إسناد مضطرب'' (سنن الدارقطنی ۴/۲۸۸ ح ۴۷۲۸)

اس مضطرب وضعیف روایت کو ابن الترکمانی اپنے مسلک کی خاطر ''فھذا سند جید'' قرار دیتے ہیں۔ (دیکھئے الجوہر النقی ۹/۳۲۸) جس روایت کی سند اور متن میں تطبیق نہ ہو سکے یا محدثینِ کرام نے اسے مضطرب قرار دیا ہو تو وہ مضطرب ہے۔ اگر محدثین کے درمیان اختلاف ہو تو راجح مرجوح دیکھ کر ترجیح ہوگی۔ یاد رہے کہ بہت سے لوگ اپنے مسلک و مذہب کی خاطر مخالفین کی بعض روایات کو مضطرب کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً نیموی نے آثار السنن میں صحیحین کی ایک حدیث کو مضطرب (مضطرب) کہہ دیا ہے۔ (ح ۵۵۰) لیکن نیموی کا یہ دعویٰ باطل ہے۔

(۲۰) بیسویں قسم: مُدْرَج کی پہچان

مدرج اسے کہتے ہیں کہ متنِ حدیث میں راوی کے کلام (تفسیر وتشریح وغیرہ) سے کچھ اضافہ ہو جائے اور سننے والا یہ سمجھے کہ یہ اضافہ مرفوع حدیث میں (درج) ہے، پھر وہ اسی طرح روایت کرنے لگے۔ اس طرح کا ادراج بہت سی صحیح، حسن اور مُسنَد وغیرہ روایات میں واقع ہوا ہے۔ (۱) سند میں بھی ادراج ہو جاتا ہے اور اس کی بہت سے مثالیں ہیں۔

حافظ ابو بکر الخطیب (البغدادی) نے اس (مدرج) کے بارے میں ایک بڑی کتاب "فصل الوصل لما أدرج فی النقل" لکھی ہے جو بہت زیادہ مفید ہے۔ (۲)

(۲۱) اکیسویں قسم: موضوع، من گھڑت (اور) جعلی (روایات) کی پہچان

موضوع روایت کے معلوم ہونے پر بہت سی دلیلیں ہیں:

(۱) جھوٹ بولنے کا قول یا فعل سے یہ اقرار کہ اس نے یہ حدیث گھڑی ہے۔

(۲) رکاکتِ الفاظ یعنی الفاظ کا لچر پن، پھپھسا پن اور ناموزونیت

(۳) فاسد مفہوم (۴) فحش بے تکا پن

(۵) قرآن اور سنتِ صحیحہ (صحیح احادیث) کی (واضح ومن کل الوجوہ) مخالفت

موضوع (من گھڑت) روایت بغیر جرح کے بیان کرنا جائز نہیں ہے تاکہ جاہل لوگ، عوام اور عامی حضرات دھوکے کا شکار نہ ہو جائیں۔

حدیث گھڑنے والوں کی کئی قسمیں ہیں: ① ان میں زنادقہ (بے دین اور ملحد لوگ) ہیں۔

---

(۱) مثلاً سنن الترمذی کی ایک حدیث (۳۱۲) میں فانتهى الناس عن القراءة مع رسول الله ﷺ إلخ امام زہری کا قول ہے جو کہ حدیث میں مدرج ہو گیا ہے۔ دیکھئے المدرج الی المدرج للسیوطی (ص۲۱ ح۶)

(۲) یہ کتاب "الفصل للوصل المدرج فی النقل" کے نام سے دو بڑی جلدوں میں مطبوع ہے۔

④ ان میں ایسے عبادت گزار ہیں جو (اپنی بے وقوفی کی وجہ سے) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ (بڑا) کام کررہے ہیں، یہ لوگ ترغیب اور فضائلِ اعمال میں حدیثیں گھڑتے ہیں تاکہ ان پر عمل کیا جائے۔

یہ کرامیہ فرقے کا ایک گروہ اور دوسرے لوگ ہیں۔ اس قسم کی حرکتیں کرنے (موضوع احادیث گھڑنے) والوں میں سب سے بُرے یہی لوگ ہیں کیونکہ بہت سے لوگ جو انھیں نیک اور سچا سمجھتے ہیں، دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہر کذاب (جھوٹے) سے زیادہ بُرے اور نقصان دہ ہیں۔

ائمہ حدیث نے ان کی ہر حرکت پر تنقید کی ہے اور اپنی کتابوں میں انھیں (جھوٹا) لکھ رکھا ہے۔

حدیثیں گھڑنے والوں کے لئے یہ بات دنیا میں عار (رسوائی) اور آخرت میں ذلت اور جہنم کا عذاب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو وہ اپنا ٹھکانا (جہنم کی) آگ میں بنالے۔[1] یہ حدیث متواتر ہے۔[2]

بعض جاہل کہتے ہیں: ہم نے آپ (ﷺ) پر جھوٹ نہیں بولا بلکہ آپ کے لئے بولا ہے۔[3]

یہ ان لوگوں کی مکمل جہالت، کم عقلی، بڑی بدکاری اور افتراء ہے کیونکہ نبی ﷺ اپنی شریعت کے کمال اور فضائل میں دوسروں کے محتاج نہیں ہیں۔

شیخ ابوالفرج (ابن الجوزی) نے موضوع روایتوں کے بارے میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ اِلا یہ کہ انھوں نے اس کتاب میں ایسی روایتوں کو درج کردیا ہے جو موضوع

(۱) صحیح بخاری: ۱۱۰، صحیح مسلم: ۳ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

(۲) قطف الازہار المتناثرۃ فی الاخبار المتواترۃ للسیوطی: ۱، لقط اللآلی المتناثرۃ فی الاحادیث المتواترۃ: ۶۱، نظم المتناثر من الحدیث المتواتر: ۲

(۳) اس پر تعاقب کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے النکت علی ابن الصلاح (۸۵۴/۲) میں کہا: یہ ان لوگوں کی عربی زبان کے ساتھ جہالت ہے کیونکہ انھوں نے احکام (وغیرہ) گھڑنے میں آپ (ﷺ) پر جھوٹ بولا ہے۔

نہیں ہیں اور ایسی موضوع روایات کو درج نہیں کیا جنھیں ذکر کرنا ضروری تھا[۱] لہٰذا (عام لوگوں کی نظر میں) یہ کتاب (اعتماد کے درجے سے) گر گئی ہے اور اس سے (حقیقی) راہنمائی حاصل نہیں ہوسکی۔[۲]

بعض اہلِ کلام سے مروی ہے کہ موضوع روایات کلیتاً موجود نہیں (معدوم) ہیں۔!

یا تو اس قائل کا اپنا ہی وجود سرے سے نہیں ہے یا پھر یہ شخص شرعی علوم سے بہت دور (اور نرا جاہل محض) ہے۔

بعض لوگوں نے اس حدیث کے ذریعے سے اس شخص کا رد کرنے کی کوشش کی ہے جس میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''مجھ پر جھوٹ بولا جائے گا''[۳] اگر یہ خبر صحیح ہو تو ضرور آپ پر جھوٹ بولا جائے گا اور اگر یہ روایت جھوٹی ہے تو مقصود حاصل ہوگیا (کہ آپ ﷺ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔)

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس سے ابھی تک (جھوٹ کا) واقع ہونا لازم نہیں آتا بلکہ

---

(۱) یہ کتاب تین جلدوں میں بغیر تحقیق سے اور چار جلدوں میں تحقیق وفہرست کے ساتھ مطبوع ہے۔

(۲) انبیاء ورسل کے علاوہ کوئی انسان بھی خطا اور اوہام سے معصوم نہیں ہے۔ حافظ ابن الجوزی کے اوہام واخطاء کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی کتابوں کی مراجعت کا موقع نہ ملا تاہم یاد رہے کہ کتاب الموضوعات میں ان کی ذکر کردہ غالب روایات موضوع ہی ہیں۔

فائدہ: حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: ابوالفرج (ابن الجوزی) کی اصطلاح میں موضوع روایت وہ ہوتی ہے جس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہو، اگرچہ اسے بیان کرنے والے نے جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولا ہو بلکہ اسے اس میں غلطی لگی ہو، اس لئے انھوں نے اپنی کتاب الموضوعات میں اس قسم کی بہت سی روایتیں بیان کی ہیں۔ علماء کے ایک گروہ نے ان بہت سی روایتوں میں ان سے اختلاف کیا اور کہا یہ اس میں سے نہیں جس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے بلکہ بعض روایات کا انھوں نے ثبوت واضح کیا ہے لیکن موضوعات کی غالب روایات علماء کے اتفاق سے باطل ہیں۔ (مجموع فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ص ۲۴۸)

سیوطی نے الموضوعات پر بہت سے تعقبات لکھے ہیں مگر ان میں سے بہت سے تعقبات پر بذاتِ خود نظر ہے۔

(۳) یہ روایت ''مجھ پر جھوٹ بولا جائے گا'' بالکل بے سند، بے اصل اور من گھڑت ہے۔

قیامت تک بہت سے زمانے باقی ہیں جن میں اس کا وقوع ممکن ہے۔

یہ قول، اس پر استدلال اور اس کا جواب ائمہ حدیث اور حفاظِ حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ کمزور چیزوں میں سے ہے۔ یہ ائمہ حدیث اور حفاظ صحیح اور ان سے کئی گنا زیادہ موضوع روایات یاد رکھتے تھے تاکہ یہ موضوع روایات ان پر یا عام لوگوں پر مخفی نہ رہ جائیں (اور وہ انھیں صحیح نہ سمجھ لیں) اللہ ان محدثین پر رحم کرے اور ان سے راضی ہو۔

(۲۲) بائیسویں قسم: مقلوب

روایت کبھی ساری سند میں مقلوب (بدلی ہوئی، اُلٹی) ہوتی ہے اور کبھی بعض میں ہوتی ہے۔ پہلی کی مثال وہ واقعہ ہے کہ جب (امام) بخاری بغداد تشریف لائے تو وہاں کے ماہر محدثین نے ایک حدیث کی سند کو دوسری حدیث کے متن پر، اور ایک حدیث کے متن کو دوسری حدیث کی سند پر لگا دیا۔ انھوں نے روایتوں کو مقلوب کر دیا مثلاً سالم کی حدیث کو نافع سے اور نافع کی حدیث کو سالم سے ملا دیا اور یہ دوسری قسم سے ہے۔

انھوں نے تقریباً ایک سو (۱۰۰) یا زیادہ حدیثوں میں ایسا کیا پھر جب انھوں نے یہ حدیثیں (امام) بخاری کو سنائیں تو آپ نے ہر حدیث کو اس کی (اصل) سند اور ہر سند کو اس کے (اصل) متن سے لگا کر بتا دیا۔ محدثینِ بغداد کی ان مقلوب و مرکب روایتوں میں سے ایک روایت بھی (امام) بخاری پر (مخفی رہ کر) رائج نہ ہو سکی۔ محدثینِ بغداد (اور عام لوگوں) نے اسے بہت عظیم جانا اور اس فن (حدیث) میں ان (امام بخاری) کے (بلند) مقام کے قائل ہو گئے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے اور جنت میں داخل کرے۔ (آمین)[1]

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے یہاں یہ تنبیہ کی ہے کہ کسی معیّن سند کے ضعیف ہونے

---

(۱) تاریخ بغداد ۲۰/۲، مشائخ البخاری لابن عدی ق ۲/۱ بحوالہ حاشیۃ المقنع فی علوم الحدیث ۲۴۲/۱، امام بخاری اور محدثینِ بغداد کی طرف منسوب یہ سارا قصہ سندِ صحیح سے ثابت نہیں ہے۔ اس قصے کی سند میں حافظ ابو احمد بن عدی کے استاذ نامعلوم و مجہول ہیں۔ نیز دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۲۵ ص ۱۲، ۱۳، مشہور واقعات کی حقیقت ص ۵۷، ۵۸

سے اس روایت کا حقیقت میں (بھی) ضعیف ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کی دوسری (صحیح یا حسن) سند ہو اِلا یہ کہ کوئی امام یہ صراحت کر دے کہ یہ حدیث صرف اسی سند سے مروی ہے۔(۱) میں (ابن کثیر) نے کہا: مناظرے میں یہ کافی ہے کہ (مخالف) مناظر نے جو سند پیش کی ہے اُس کا ضعیف ہونا ثابت کر دیا جائے، وہ (لاجواب ہو کر) چُپ ہو جائے گا کیونکہ اصل یہی ہے کہ دوسری کوئی روایت (اس مناظر کی مؤید) نہیں ہے، اِلا یہ کہ دوسری کوئی ثابت (صحیح و حسن) سند پیش کر دی جائے۔ واللہ اعلم (۲)

(ابن الصلاح نے) کہا: ترغیب و ترہیب، قصص و مواعظ اور ان جیسے دوسرے ابواب (مثلاً مناقب و فضائل) میں موضوع کے علاوہ دوسری روایتیں (سند سے) بیان کر دینا جائز ہے لیکن ایسا کرنا صفاتِ باری تعالیٰ اور حلال و حرام میں جائز نہیں ہے۔

انھوں نے کہا کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ نے (سند کے ساتھ) ضعیف روایت بیان کرنے کی اجازت دے دی ہے۔(۳)

انھوں نے کہا: جب آپ بغیر سند کے، نبی ﷺ کی طرف کوئی روایت منسوب کریں تو یہ نہ کہیں کہ "نبی ﷺ نے ایسا فرمایا ہے" اور اس طرح کے جو الفاظ ہیں جن سے جزم (ویقین) مراد ہوتا ہے، استعمال نہ کریں بلکہ صیغۂ تمریض سے بیان کریں اور اسی طرح جس روایت کے صحیح ہونے میں شک ہو اُسے بھی صیغۂ تمریض سے ہی بیان کرنا چاہئے۔

---

(۱) یہ بات تو صحیح ہے لیکن یاد رہے کہ جب تک دوسری صحیح یا حسن لذاتہ روایت نہ ملے تو معین ضعیف سند مردود و ناقابلِ حجت ہی رہتی ہے۔ نیز دیکھئے حاشیہ نمبر ۲

(۲) یہ بہت ہی اہم فائدہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے بیان فرمایا ہے۔ بعض لوگ اپنی مرضی کی بعض روایات کو ضعیف + ضعیف + ضعیف کہہ کر حسن لغیرہ بنا دیتے ہیں (مثلاً دیکھئے احمد رضا خان بریلوی کی کتاب فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۴۲۹ تا ۶۲۸) حالانکہ قولِ راجح میں حسن لغیرہ روایت حجت ہی نہیں ہے بلکہ ضعیف و مردود کی ایک قسم ہے۔ یہ لوگ اپنی مرضی کے خلاف بہت سی ایسی روایات جو ان کے اصول پر "حسن لغیرہ" بنتی ہیں، رد کر دیتے ہیں۔!

(۳) تحقیقِ راجح میں ضعیف روایات کا بطورِ حجت بیان کرنا فضائل میں بھی جائز نہیں۔ تفصیلی دلائل کے لئے دیکھئے ماہنامہ الحدیث: ۵۳ ص ۱۸۔۳۳

(۲۳) تیئیسویں قسم: کس کی روایت مقبول اور کس کی مقبول نہیں (یعنی مردود) ہے؟ اور جرح وتعدیل کا بیان

مقبول اس ثقہ (قابلِ اعتماد) ضابط (حافظے سے اگر بیان کرے تو مضبوط حافظے والا اور اگر کتاب سے بیان کرے تو اپنا خط یا کتاب مضبوطی سے پہچانتا ہو) راوی کو کہتے ہیں جو مسلم (مسلمان) عاقل، بالغ، فسق اور بداخلاقیوں سے سالم (محفوظ) ہو، اس کے ساتھ بیدار مغز ہوشیار ہو، غافل نہ ہو، اگر حافظے سے بیان کرے تو حافظ (یاد رکھنے والا) ہو، اگر روایت بالمعنی کرے تو اس کا مفہوم جاننے والا ہو۔ ان شرطوں میں سے اگر کوئی ایک شرط رہ جائے تو اس راوی کی روایت مردود ہو جاتی ہے۔

راوی کی عدالت اس کی نیک شہرت اور اچھی تعریف سے ثابت ہو جاتی ہے یا جسے ائمہ حدیث یا دو امام یا ایک (امام) قولِ راجح میں جس کی تعدیل (توثیق) کرے، اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس (امام) کے راوی سے (مجرد) روایت کرنے کے ساتھ (بھی) تعدیل ثابت ہو جاتی ہے۔[1]

ابن الصلاح نے کہا: ابن عبدالبر نے وسعت اختیار کرتے ہوئے کہا ہے:

ہر صاحبِ علم جو اس (علم) کے ساتھ توجہ پر مشہور ہے وہ عادل ہے۔

اس کا معاملہ عدالت (عادل ہونے) پر محمول ہے اِلا یہ کہ اس پر جرح واضح ہو جائے کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"یَحْمِلُ هذا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عَدُوْلُه"

(۱) یہ آخری قول صحیح نہیں ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ

اس علم کو ہر بعد میں آنے والے عادل لوگ اُٹھائیں (پڑھیں پڑھائیں) گے۔ [1]

(ابن الصلاح نے) کہا: انھوں (ابن عبدالبر) نے جو کہا ہے وہ ناپسندیدہ وسعت (پھیلاؤ، نرمی) ہے۔ واللہ اعلم

میں (ابن کثیر) نے کہا: انھوں (ابن عبدالبر) نے جو حدیث بیان کی ہے وہ اگر صحیح ہوتی تو ان کی بات قوی تھی لیکن اس حدیث کی صحت میں مضبوط نظر ہے اور غالب یہی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم [2]

اور (بعض اوقات محدثین کے سامنے) راوی کا ضابط ہونا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی روایات میں الفاظ اور معنی کے لحاظ سے ثقہ راویوں کی موافقت کر رکھی ہوتی ہے اور اگر اس نے ثقہ راویوں کی مخالفت کر رکھی ہو تو وہ غیر ضابط (ضعیف ومردود الروایۃ) ہوتا ہے۔ [3]

تعدیل بغیر ذکرِ سبب کے مقبول ہوتی ہے کیونکہ اسباب کی تعداد لمبی ہے لہٰذا اسے مطلقاً قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جرح کو صرف اسی وقت قبول کیا جاتا ہے جب جرح مفسر ہو کیونکہ اسبابِ جرح میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔

---

(۱) التمہید (۱/۲۸) حافظ ابن عبدالبر کی بیان کردہ روایت ضعیف اور غیر ثابت ہے۔ بعض علماء نے جمع وتفریق کر کے اسے حسن لغیرہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن حسن لغیرہ بھی ضعیف ومردود ہی ہوتی ہے۔

(۲) یہ روایت اگر صحیح بھی ہوتی تو مذکورہ استدلال پر واضح نہیں ہے۔ اس سے تمام حاملینِ علم کا عادل وضابط ہونا ثابت نہیں ہوتا اور عین ممکن ہے کہ اس سے مراد اغلبیت واکثریت ہو۔ واللہ اعلم

فائدہ: زمانۂ تدوینِ حدیث اور تیسری صدی ہجری کے بعد اگر کوئی راوی روایتِ حدیث، علم اور کسی نیک صفت کے ساتھ مشہور ہو جائے اور اس پر کوئی جرح ثابت نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کہ ضرور اس کی توثیق ثابت کی جائے بلکہ راجح یہی ہے کہ ایسے راوی کی روایت حسن لذاتہ کے درجے سے نہیں گرتی۔ واللہ اعلم

(۳) یہ موافقت اور عدمِ موافقت تلاش کرنے کا دور گزر چکا ہے۔ اس فن کے بڑے ماہرین میں سے امام بخاری، مسلم، دارقطنی اور ابن عدی وغیرہم تھے۔

ایک چیز ایک جارح کے نزدیک فسق کا باعث (جرح) ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ جرح کر دیتا ہے حالانکہ حقیقت میں یا دوسروں کے نزدیک یہ جرح نہیں ہوتی، اس لئے جرح میں بیانِ سبب کی شرط لگائی گئی ہے۔

شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے کہا: جرح وتعدیل کی کتابوں میں اکثر پایا جاتا ہے کہ فلاں ضعیف ہے یا متروک ہے وغیرہ، اگر ہم اس پر بھروسا نہیں کریں گے تو (جرح وتعدیل کا) بہت بڑا دروازہ بند ہو جائے گا۔ (پھر انھوں نے) یہ جواب دیا کہ اگر ہم اس پر اکتفا نہیں کرتے تو اس راوی کے بارے میں توقف کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اس کے بارے میں شک ہو گیا ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اس فن (علمِ حدیث) کے ماہر اماموں کا کلام اسباب کے ذکر کے بغیر تسلیم کرنا چاہئے کیونکہ وہ اس علم کی معرفت، اطلاع اور عبور میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ وہ انصاف، دیانت، مہارت اور نصیحت (خیر خواہی) سے موصوف تھے، خاص طور پر وہ تمام (ماہرین) جب کسی راوی کو ضعیف، متروک یا کذاب وغیرہ قرار دیں تو ان ائمہ کی سچائی، امانت اور نصیحت کی وجہ سے ماہر محدّث ان کی موافقت سے ذرا بھی پیچھے نہیں رہتا۔

اسی لئے (امام) شافعی احادیث پر اپنے اکثر کلام میں فرماتے تھے: ''علمائے حدیث اسے ثابت نہیں سمجھتے'' وہ اس مجرد قول کے ساتھ حدیثِ مذکور کو رد کر دیتے اور اس سے حجت نہیں پکڑتے تھے۔ واللہ اعلم (۱)

....

(۱) جرح وتعدیل میں ہمیشہ مفسر کو مبہم پر اور خاص کو عام پر ترجیح حاصل ہے مثلاً ایک محدث نے کہا: سفیان بن حسین ثقہ ہیں، دوسرے نے کہا: سفیان بن حسین جب زہری سے روایت کریں تو ضعیف ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفیان بن حسین اگر زہری سے روایت کریں تو ضعیف ہیں اور اگر زہری کے علاوہ دوسروں سے روایت کریں تو ثقہ ہیں۔

فائدہ (۱): جب جرح وتعدیل دونوں مبہم ہوں یا دونوں مفسر ہوں تو عدمِ تطبیق کی صورت میں ہمیشہ جمہور محدثین کو ہی ترجیح ہو گی۔

اگر جرح وتعدیل میں تعارض ہو جائے تو اس حالت میں جرح مفسر ہونی چاہئے۔

(پھر) کیا یہ (جرح مفسر) مقدم ہے یا اکثریت اور زیادہ ماہرین کو ترجیح ہوگی؟

اس مسئلے میں اصولِ فقہ، فروعِ فقہ اور علمِ حدیث میں مشہور اختلاف ہے۔

[صحیح یہ ہے کہ جرح اگر مفسر ہو تو مطلقاً مقدم ہے] واللہ اعلم (۱)

صحیح یہ ہے کہ جرح وتعدیل میں ایک (محدث وامام) کا قول کافی ہے۔ رہی ثقہ کی اپنے استاذ سے (مجرد) روایت تو کیا اس سے اس شیخ کی تعدیل ثابت ہوتی ہے؟

اس بارے میں تین اقوال ہیں:

تیسرا قول یہ ہے کہ اگر وہ (اپنے نزدیک) صرف ثقہ سے ہی روایت کرتا تھا تو توثیق ہے ورنہ نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ اس راوی کی توثیق نہیں ہوتی حتی کہ اگر کوئی یہ بھی کہہ دے کہ اس کے سارے استاذ عادل (ثقہ) ہیں (تو بھی توثیق نہیں ہوتی۔) (۲)

اگر راوی یہ کہے کہ "مجھے یہ حدیث ثقہ نے بیان کی ہے" تو صحیح یہ ہے کہ یہ اس راوی کی

= فائدہ (۲): کتبِ جرح وتعدیل میں اماموں کی طرف منسوب اقوال کے بارے میں یہ ضرور تحقیق کرنی چاہئے کہ یہ اقوال ان اماموں سے ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ صرف تہذیب الکمال، میزان الاعتدال اور تہذیب التہذیب پر اندھا دھند (بغیر تحقیق کے) اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے مثلاً مؤمل بن اسماعیل کے بارے میں "منکر الحدیث" کا قول امام بخاری سے ثابت ہی نہیں ہے جسے بغیر صحیح سند کے تہذیب الکمال وتہذیب التہذیب وغیرہما میں لکھ دیا گیا ہے۔

(۱) اگر جرح مفسر سے مراد راوی کو مدلس، مختلط یا ضعیف فی فلان کہنا ہے تو تعدیلِ مبہم کے مقابلے میں جرح مفسر مطلقاً مقدم ہے اور اگر اس سے مراد راوی کو کذاب، متروک، کثیر الغلط سیئ الحفظ اور ضعیف وغیرہ کہنا ہے تو پھر جمہور اور اکثر محدثین کو مطلقاً ترجیح حاصل ہے۔ چند محدثین کی شاذ جرح لے کر جمہور محدثین کی توثیق کو رد کر دینا غلط ہے۔

تنبیہ: ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے کہ اپنی مرضی کی روایت کے راوی پر تمام جروح کو مبہم کہہ کر رد کر دیں اور مرضی کے خلاف روایت پر ایسی تمام جروح کی مدد سے جرح کر کے روایت کو رد کر دیں، ایسا کرنا انھی لوگوں کا کام ہے جو علم حدیث کو بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں۔ فائدہ: جس راوی کی توثیق جمہور محدثین سے ثابت ہو جائے پھر بعض محدثین کا اس سے روایت ترک کر دینا یا "ترکه فلان" کہہ دینا جرح مبہم اور مردود ہے۔

(۲) اگر ایک راوی کے دو یا زیادہ شاگرد ہیں اور اس پر کوئی جرح نہیں ہے۔ ابن حبان یا کسی متساہل محدث =

توثیق نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے یہ اس کے نزدیک ثقہ ہو لیکن دوسروں کے نزدیک ثقہ نہ ہو۔

یہ بات واضح ہے۔ والحمد للہ

(ابن الصلاح نے) کہا: اس طرح عالم کا کسی حدیث کے مطابق فتویٰ یا عمل اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ یہ حدیث اس کے نزدیک صحیح ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اس میں نظر ہے، جب اس باب میں اس حدیث کے سوا اور کچھ نہ ہو یا اس نے اپنے فتویٰ یا فیصلے میں اس سے استدلال کیا ہو یا اس کے مقتضا (تقاضے اور مطلوب) پر استشہاد کیا ہو۔[1]

ابن الحاجب (النحوی) نے کہا: عدالت کی شرط لگانے والے حاکم کا حکم بالاتفاق تعدیل (وتوثیق) ہے۔ (منتہی الوصول ۲/۶۶)

کسی عالم کا کسی خاص حدیث کو جاننے کے باوجود چھوڑ دینا بالاتفاق حدیث پر جرح نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اسے صحیح سمجھتے ہوئے اپنے نزدیک کسی مضبوط معارض (مثلاً عمومِ حدیث یا اجماع وغیرہ) کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا ہو۔

مسئلہ: جمہور محدثین کے نزدیک اس راوی کی روایت مقبول نہیں ہے جو ظاہری و باطنی لحاظ

= نے اس کی توثیق کر رکھی ہے پھر ایسی حالت میں اس کی دوسری توثیق یا اس کا ایسا شاگرد مل جائے جو عام طور پر اپنے نزدیک صرف ثقہ سے ہی روایت کرتا تھا تو ایسا راوی حسن لذاتہ کے درجے کا راوی ہوتا ہے۔

فائدہ (۱): اگر کوئی محدث کسی حدیث کو "صحیح" "سندہ صحیح" "حسن" یا "سندہ حسن" وغیرہ کہہ دے تو یہ اس کی طرف سے اس حدیث کے ہر راوی کی توثیق ہوتی ہے اِلا یہ کہ کسی خاص راوی کے بارے میں اس کی جرح ثابت ہو جائے مختصر یہ کہ حدیث کی تصحیح و تحسین اُس کے راویوں کی توثیق ہوتی ہے۔

فائدہ (۲): اگر کسی مجہول یا مستور راوی کی توثیق صراحتاً یا اشارتاً کم از کم دو متساہل محدثین مثلاً ابن حبان اور ترمذی یا ابن حبان اور الحاکم سے ثابت ہو جائے تو ایسا راوی حسن الحدیث ہوتا ہے۔

(۱) عین ممکن ہے کہ اس عالم نے اپنے فتوے یا عمل پر کسی آیت کے عموم، قیاس یا اجتہاد سے استدلال کیا ہو یا آثارِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کو پیشِ نظر رکھا ہو لہٰذا حافظ ابن کثیر کا ابن الصلاح پر رد صحیح نہیں ہے۔

سے مجہول العدالت (مجہول العین) ہو۔[1] جس کی باطنی عدالت مجہول (نامعلوم) ہو لیکن ظاہر میں وہ عادل ہو تو اسے مستور کہتے ہیں۔ بعض شوافع (مثلاً بغوی اور رافعی) نے اس کی روایت کو قبول کیا ہے۔ فقیہ سلیم بن ایوب نے اسے ترجیح دی ہے اور ابن الصلاح نے ان کی موافقت کی ہے۔[2] میں نے اس کی تحقیق (اپنی کتاب) المقدمات میں لکھی ہے۔ واللہ اعلم[3]

رہا ایسا مبہم (راوی) جس کا نام معلوم نہ ہو یا نام معلوم ہو مگر مجہول العین ہو تو ہمارے علم کے مطابق کوئی بھی اس کی روایت قبول نہیں کرتا لیکن بعض علماء کے نزدیک اگر یہ تابعین میں سے یا خیر القرون کا راوی ہو تو اس کی روایت سے کئی مقامات پر تسلی اور راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ [اس کی روایت سے صحیح حدیث کی تشریح، تفسیر اور تعین وغیرہ کا کام لیا جا سکتا ہے۔!] مسند امام احمد میں اس طرح کی بہت سی روایتیں ہیں۔ واللہ اعلم

خطیب بغدادی وغیرہ نے کہا: راوی کی جہالت (جہالتِ عین) علماء کی معرفت یا دو ثقہ راویوں کی روایت سے ختم ہو جاتی ہے۔ ان دو راویوں کی روایت کی وجہ سے وہ ثقہ نہیں بن جاتا۔ (بلکہ مجہول الحال رہتا ہے۔ دیکھئے الکفایہ ص ۱۴۹)

اسی طریقے پر ابن حبان وغیرہ گامزن تھے بلکہ وہ (حافظ ابن حبان) مجرد اس حال میں اس راوی کو عادل (ثقہ) سمجھتے تھے۔ واللہ اعلم[4]

انھوں (علماء) نے کہا: جس سے صرف ایک راوی روایت کرے مثلاً عمرو بن ذی مُر، جبار الطائی اور سعید بن ذی حُدان _ ان سے صرف ابو اسحاق السبیعی نے روایت بیان کی ہے۔ جُری بن کلیب _ ان سے صرف قتادہ (بن دعامہ) نے روایت بیان کی ہے۔ خطیب نے کہا: اور ہزہار بن میزن _ اس سے صرف (عامر بن شراحیل) الشعبی نے

(۱) جس راوی کا صرف ایک شاگرد ہو اور اس کی توثیق کسی سے ثابت نہ ہو، وہ مجہول العین ہوتا ہے۔

(۲) محب الطبری بھی اسے صحیح سمجھتے تھے۔ دیکھئے المقنع لابن الملقن (۲۵۶/۱) ! (۳) جس کے دو یا زیادہ شاگرد ہوں اور اس کی توثیق کسی سے ثابت نہ ہو تو اسے مجہول الحال یا مستور کہتے ہیں۔ ایسے راوی کی روایت قولِ راجح میں ضعیف ہوتی ہے۔ (۴) معلوم ہوا کہ حافظ ابن حبان مجہول راویوں کی توثیق میں متساہل تھے۔

روایت بیان کی ہے۔ ابن الصلاح نے کہا: اور اس سے (سفیان) ثوری نے (بھی) روایت کی ہے۔[1]

ابن الصلاح نے کہا: بخاری نے مرداس الاسلمی سے روایت لی ہے اور ان سے قیس بن ابی حازم کے علاوہ کسی نے روایت بیان نہیں کی۔ مسلم نے ربیعہ بن کعب سے روایت لی ہے اور ان سے صرف ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن (بن عوف) نے روایت بیان کی ہے۔

(ابن الصلاح نے) کہا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری ومسلم کے نزدیک ایک راوی کی روایت سے بھی جہالت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات قابلِ توجہ ہے جیسا کہ ایک محدث کی توثیق پر بھروسا کرنے میں اختلاف ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: یہ توجیہ اچھی ہے لیکن بخاری ومسلم نے ایک راوی کی روایت پر اس لئے اعتماد کیا ہے کہ یہ دونوں (مرداس اور ربیعہ) صحابی ہیں اور دوسرے (راویوں) کے خلاف صحابہ کی جہالت مضر نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

مسئلہ: اگر ایسا بدعتی راوی ہو جس کی بدعت کفر والی (مکفرہ) ہو تو اس کی روایت کے مردود ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے اور اگر بدعتِ مکفرہ نہ ہو لیکن وہ جھوٹ بولنا حلال سمجھتا ہو تو اس کی روایت بھی مردود ہے۔ اگر وہ جھوٹ بولنا حلال نہ سمجھتا ہو تو کیا اس کی روایت مقبول ہوگی یا نہیں؟ یا (بدعت کی طرف) داعی (دعوت دینے والے) اور غیر داعی میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟ قدیم وجدید زمانے سے اس میں اختلاف چلا آرہا ہے۔

جمہور (علماء) یہ کہتے ہیں کہ داعی اور غیر داعی میں فرق کیا جائے گا۔

ابن حبان نے اس پر اتفاق نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہمارے تمام ائمہ کے نزدیک (بدعت کے داعی کی) روایت حجت نہیں ہے، اس میں مجھے کوئی اختلاف معلوم نہیں ہے۔"

(دیکھئے صحیح ابن حبان ۱/۱۴۹، کتاب الثقات ۶/۱۴۰، کتاب المجروحین ۱/۸۱)

....

(۱) ابن الصلاح کا یہ قول وہم ہے۔ دیکھئے ابن الملقن کی کتاب المقنع (۱/۲۵۹)

اور یہی قول (امام) شافعی سے (بغیر کسی سند کے؟) مروی ہے۔ ابن الصلاح نے کہا:
یہ قول سب سے زیادہ انصاف والا اور راجح ہے۔ (بدعتی کی روایت کو) مطلقاً ممنوع قرار دینا بعید ہے اور ائمہ حدیث کے مشہور عمل کے خلاف ہے کیونکہ ان کی کتابیں ایسے مبتدعین سے بھری ہوئی ہیں جو بدعت کے داعی نہیں تھے۔ صحیحین میں ایسے مبتدعین کی شواہد واصول میں بہت سی روایتیں ہیں۔ واللہ اعلم (۱)

میں (ابن کثیر) نے کہا: (امام) شافعی نے کہا: میں روافض میں سے خطابیہ کے سوا سب (موثق) بدعتیوں کی گواہی قبول کرتا ہوں کیونکہ یہ خطابیہ اپنے حامیوں کے لئے جھوٹی گواہی دینا جائز سمجھتے ہیں۔ (دیکھئے کتاب الام ۶/۲۰۶ ومناقب الشافعی ۱/۴۶۸، السنن الکبریٰ ۱۰/۲۰۸، اور الکفایہ ۱۹۴، ۱۹۵)

اس قول میں (امام) شافعی نے داعی اور غیر داعی میں کوئی فرق نہیں کیا۔ پھر معنوی لحاظ سے ان دونوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟

یہ بخاری ہیں جنھوں نے (سیدنا) علی (رضی اللہ عنہ) کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کی تعریف کرنے والے (!) عمران بن حطان الخارجی سے (صحیح بخاری میں) روایت لی ہے اور (حالانکہ) یہ شخص بدعت کے بڑے داعیوں میں سے تھا۔ واللہ اعلم (۲)

مسئلہ: جس شخص نے لوگوں پر جھوٹ بول کر پھر توبہ کر لی ہو (اور اس توبہ پر ثابت قدم ہو) تو ابوبکر الصیرفی کے برخلاف اس کی روایت مقبول ہوتی ہے۔

---

(۱) جو راوی جمہور کے نزدیک ثقہ وصدوق ہو، چاہے بدعتی ہو یا سُنی، بدعت کا داعی ہو یا داعی نہ ہو، اس کی روایت حسن یا صحیح ہوتی ہے اور یہی قول راجح ہے۔ دیکھئے عصرِ حاضر کے ذہبی شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی کی مشہور کتاب "التنکیل" (۱/۴۲۔۵۲)

(۲) عمران بن حطان خارجی کو جمہور محدثین نے ثقہ وصدوق قرار دیا ہے لہٰذا وہ حسن الحدیث راوی تھے۔ ابوالفرج الاصبہانی (الاغانی ۱۶/۱۵۳) المبرد (الکامل ۳/۱۶۹) اور ذہبی (سیر اعلام النبلاء ۴/۲۱۵) وغیرہم نے بیان کیا ہے کہ عمران مذکور نے عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی (لعنہ اللہ) کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔ (!) لیکن یہ قصیدہ یا اس کے اشعار باسند صحیح عمران بن حطان سے ثابت نہیں لہٰذا وہ اس قصیدے کے الزام سے بری ہیں۔ واللہ اعلم

رہا وہ (راوی) جس نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) حدیث میں جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو ابن الصلاح نے (امام) احمد بن حنبل اور (امام) بخاری کے استاذ (امام) ابوبکر الحمیدی سے نقل کیا ہے کہ اس کی روایت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔[1]

ابوالمظفر السمعانی نے کہا: جو شخص صرف ایک حدیث میں جھوٹ بولے تو اس کی سابقہ تمام احادیث کو رد کرنا ضروری ہے۔ (دیکھئے قواطع الادلہ ۱/۳۲۴، مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۵۱)

میں (ابن کثیر) نے کہا: علماء میں سے بعض اس آدمی کو کافر سمجھتے ہیں جس نے جان بوجھ کر حدیثِ نبوی میں جھوٹ بولا ہے اور بعض اسے قتل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی تحقیق میں نے (اپنی کتاب) ''المقدمات'' میں لکھی ہے۔ جس شخص کو حدیث میں (غیر ارادی طور پر) غلطی لگ جائے پھر اسے صحیح بات سمجھا دی جائے مگر وہ رجوع نہ کرے تو (امام) ابن المبارک، احمد بن حنبل اور حمیدی نے کہا: اس کی روایت بھی قبول نہیں کی جائے گی۔[2]

بعض علماء (مثلاً حافظ ابن حبان) نے درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر اس راوی کا صحیح بات کی طرف رجوع نہ کرنا ضد اور دشمنی کی وجہ سے ہو تو اسے بھی اس کے ساتھ ملا دیا جائے گا جس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے ورنہ نہیں ملایا جائے گا۔ واللہ اعلم

یہاں سے (معلوم ہوتا ہے کہ) ہر ممکن طریقے سے جھوٹ سے بچنا چاہئے اور صرف قابلِ اعتماد اصل (صحیح و ثابت قلمی نسخے یا صحیح و ثابت مطبوع کتاب) سے ہی روایت کرنی چاہئے۔ شاذ اور منکر روایات سے بچنا چاہئے۔ قاضی ابو یوسف (یعقوب بن ابراہیم) نے

---

(۱) قول احمد (الکفایہ للخطیب ص ۱۱۷) وسندہ ضعیف، کتاب الخلال بحوالہ طبقات الحنابلۃ لابن ابی یعلی ۱/۱۹۸
قول الحمیدی (الکفایہ ص ۱۱۸) فیہ محمد بن احمد بن الحسین ولم أعرفہ وان کان ھو محمد بن احمد بن الحسن الصواف فالسند صحیح

(۲) قول ابن المبارک (الکامل لابن عدی ۱/۱۶۱، دوسرا نسخہ ۱/۲۵۷، الکفایہ ص ۱۴۳) اس میں قاسم بن عبداللہ السراج کی توثیق نامعلوم ہے لہٰذا یہ سند ضعیف ہے۔
قول احمد بن حنبل (الکفایہ ص ۱۴۴) اس کی سند حسن ہے۔ قول حمیدی (الکفایہ ص ۱۴۴) اس روایت کی سند میں اگر محمد بن احمد بن الحسین سے مراد محمد بن احمد بن حسن الصواف ہے تو سند صحیح ہے۔

کہا: جو شخص غریب روایات اکٹھی کرتا رہتا ہے تو وہ جھوٹ (بھی) بولتا ہے۔[1]

اثر یعنی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ "آدمی کے گناہگار (جھوٹا) ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سنائی حدیث آگے بیان کرتا پھرے۔" (صحیح مسلم ۱/۸ ح ۵ وسندہ صحیح)

مسئلہ: جب ایک ثقہ اپنے ثقہ استاذ سے ایک حدیث بیان کرے پھر اس کا شیخ (استاذ) کلیتاً اس حدیث کی روایت کا انکار کر دے تو ابن الصلاح نے یہ (انداز) اختیار کیا کہ اس کے بالجزم انکار کی وجہ سے یہ روایت قبول نہیں کی جائے گی اور اس وجہ سے راوی (ومروی عنہ) کی عدالت پر کوئی جرح نہیں ہوگی، برخلاف اس کے کہ اگر استاذ یہ کہے: مجھے اس حدیث کا سننا معلوم نہیں ہے تو یہ روایت مقبول ہوگی۔ اگر راوی اپنی روایت بھول جائے تو جمہور کے نزدیک یہ مقبول ہوگی۔ بعض حنفیوں نے اسے رد کر دیا ہے جیسے کہ سلیمان بن موسیٰ نے "عن الزهري عن عروة عن عائشة" کی سند سے (مرفوعاً) بیان کیا: جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔ ابن جریج نے کہا: پھر میری زہری سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے یہ حدیث پوچھی تو وہ اسے نہیں پہچانتے تھے۔[2]

جیسے ربیعہ (بن عبدالرحمٰن الرائے) نے سہیل بن ابی صالح (ذکوان) سے انھوں نے اپنے ابا سے انھوں نے (سیدنا) ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت بیان کی کہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) ایک گواہ اور ایک قسم کے ساتھ فیصلہ کیا۔ پھر بیماری کی وجہ سے سہیل یہ حدیث بھول گئے تو وہ یہ حدیث اس طرح بیان کرتے: "مجھے ربیعہ نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی۔"

میں (ابن کثیر) نے کہا: پہلی روایت سے یہ زیادہ قابلِ قبول ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے "من حدّث بحديث ثم نسي۔"[3]

(۱) اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف بن حیان (۳/۲۵۸) بلفظ: "ومن طلب الحديث بالغرائب كذب" وسندہ صحیح (۲) مسند احمد (۶/۴۷ ح ۲۴۲۰۵) بسند صحیح عن ابن جریج بہ۔

(۳) اس مسئلے پر سیوطی کی ایک چھوٹی سی کتاب "تذكرة المؤتسي فيمن حدّث ونسي" مطبوع ہے۔

مسئلہ: جو شخص حدیث بیان کرنے پر اُجرت (مزدوری) لے، کیا اس کی روایت قبول کی جائے گی یا نہیں؟ (امام) احمد (بن حنبل)، اسحاق (بن راہویہ) اور ابو حاتم (الرازی) سے مروی ہے کہ اس بد اخلاقی کی وجہ سے اس سے روایت نہیں لی جائے گی۔ [1]

ابو نعیم الفضل بن دکین (الکوفی)، علی بن عبدالعزیز اور دوسروں نے اس کی اجازت دی ہے [2] جیسے کہ تعلیمِ قرآن کی اُجرت جائز ہے۔ صحیح بخاری میں یہ ثابت ہے کہ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) ''بے شک تم جس پر اُجرت لیتے ہو اس میں سب سے زیادہ مستحق کتاب اللہ ہے۔'' (صحیح البخاری: ۵۷۳۷)

فقیہِ عراق شیخ ابو اسحاق الشیرازی نے بغداد میں ابو الحسن بن النقور (متوفی ۴۷۰ھ) کے لئے فتویٰ دیا کہ وہ اُجرت لے سکتے ہیں، کیونکہ محدثین نے انھیں روایتِ حدیث کی وجہ سے بال بچوں کے لئے کمائی سے (روک کر) مشغول کر دیا تھا۔

مسئلہ: خطیب بغدادی نے کہا: تعدیل کی اعلیٰ ترین عبارات ''حجة'' اور ''ثقة'' ہیں۔ اور جرح کی ادنیٰ ترین عبارت ''کذاب'' کہنا ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ان کے درمیان بہت سے اُمور ہیں جن کا ضبط مشکل ہے۔

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے اس کے لئے مراتب پر کلام کیا ہے۔

(یاد رہے کہ) بعض اشخاص کی خاص اصطلاحات ہیں جنھیں جاننا ضروری ہے۔

....

(۱) قول احمد (الکفایہ ص ۱۵۴) اس کی سند صحیح ہے۔
قول اسحاق بن راہویہ (الکفایہ ص ۱۵۴) اگر یہ روایت تاریخ نیشاپور میں مل جائے تو پھر اس کی سند صحیح ہے۔ ابراہیم الصیدلانی کی حدیث کو حاکم اور ذہبی دونوں نے صحیح علیٰ شرط الشیخین قرار دیا ہے۔ دیکھئے المستدرک (۱/۶۴۷ ح ۱۷۵۱)

(۲) عمل ابی نعیم (الکفایہ ص ۱۵۶، وسندہ ضعیف) اس میں کئی راویوں مثلاً علی بن ابی عمرو البلخی وغیرہ کی توثیق نامعلوم ہے۔
عمل علی بن عبدالعزیز المکی البغوی (الکفایہ ص ۱۵۶) وسندہ صحیح۔
حافظ ذہبی نے عبداللہ بن داود الواسطی کے ذکر میں کہا: ''بخاری نے کہا: فیہ نظر، آپ یہ بات صرف اُسی کے بارے میں کرتے ہیں جو عام طور پر اُن کے نزدیک مُتہم (سخت ضعیف) ہوتا ہے۔'' (میزان الاعتدال ۲/۴۱۶)

اس میں سے (امام) بخاری کا یہ قول ہے کہ جب وہ کسی آدمی کے بارے میں "سکتوا عنه" یا "فیه نظر" کہیں تو یہ ان کے نزدیک ادنیٰ ترین اور ردی (بہت شدید) جرح ہوتی ہے لیکن وہ جرح میں الفاظ بہت لطیف (نرم) استعمال کرتے ہیں، اسے خوب سمجھ لیں۔[1]

ابن معین نے کہا: میں جس کے بارے میں "لیس به بأس" کہوں تو وہ (میرے نزدیک) ثقہ ہوتا ہے۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۲۲ وسندہ صحیح، تاریخ ابن ابی خیثمہ ص ۵۹۲ ح ۱۴۲۳، وسندہ صحیح)

ابن ابی حاتم (الرازی) نے کہا: جب کسی کے بارے میں "صدوق" یا "محله الصدق" یا "لا بأس به" کہا جائے تو یہ راوی ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جن کی حدیث لکھی جاتی ہے اور ان کے بارے میں تحقیق جاری رکھی جاتی ہے۔ (تقدمۃ الجرح والتعدیل ۱/۳۷)

ابن الصلاح نے (امام) احمد بن صالح المصری سے نقل کیا کہ "صرف اسی راوی کی حدیث ترک کی جاتی ہے جس کے متروک ہونے پر سب کا اجماع ہو۔"

(مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۶۰، کتاب المعرفۃ والتاریخ للامام یعقوب بن سفیان الفارسی ۲/۱۹۱، وسندہ صحیح)

ابن الصلاح نے اس بارے میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ محدثین کی عبارتوں پر واقفیت رکھنے والا اُن کی غالب عبارتوں اور قرینوں سے اُن کا مقصد سمجھ جاتا ہے اور اللہ توفیق دینے والا ہے۔ ابن الصلاح نے کہا: ہمارے زمانے میں عام طور پر شروطِ اہلیت مفقود ہو گئی ہیں، اب صرف سلسلۂ سند کے متصل ہونے کی ہی رعایت ہے لہٰذا چاہئے کہ استاذ فسق وغیرہ کے ساتھ مشہور نہ ہو اور اس کی روایت علمِ حدیث کے ماہر مشائخ کے ضبط سے اخذ شدہ ہو۔ واللہ اعلم[2]

---

(۱) امام بخاری نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں منکر الحدیث کہا گیا ہے، میں ان سے روایت لینے کا قائل نہیں ہوں اور اگر سکتوا عنہ کہیں تو اُن سے بھی میں روایت لینے کا قائل نہیں۔ (التاریخ الاوسط ۲/۱۰۷)

(۲) شیخ احمد شاکر مصری نے کہا: عدالتِ راوی کی سابقہ شرائط متقدمین میں دقت کے ساتھ تلاش کی جاتی ہیں، رہے تیسری صدی ہجری کے بعد والے متاخرین تو ان کا مسلمان بالغ عاقل اور علانیہ فسق و بداخلاقی سے محفوظ ہونا کافی ہے۔ اس کا سماع اپنے استاذ سے ثابت ہو اور وہ قابلِ اعتماد اصل (نسخے) سے روایت بیان کرتا ہو...... الخ

دیکھئے الباعث الحثیث (ص ۱۱۱، مع تعلیق الالبانی ۱/۳۲۱)

(۲۴) چوبیسویں قسم: کیفیتِ سماعِ حدیث، اس کا حصول اور ضبط

چھوٹے بچوں کا گواہی اور روایات حاصل کر کے حالتِ کمال: بلوغ میں انھیں بیان کرنا صحیح ہے اور اسی طرح کفار کا اسلام لانے کے بعد حالتِ کفر کی گواہیاں اور روایات بیان کرنا صحیح ہے۔ بچوں کو حدیثِ نبوی سنانے میں جلدی کرنی چاہیے۔

اس زمانے اور سابقہ ادوار میں یہ عام عادت رہی ہے کہ پانچ سال تک کے چھوٹے بچے کا مجلسِ سماع میں حاضر ہونا اور پانچ سال کے بعد والے کا سماع لکھا جاتا ہے۔

انھوں نے (سیدنا) محمود بن الربیع (رضی اللہ عنہ) کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انھیں وہ کُلی یاد تھی جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے گھر کے ڈول (کے پانی) سے (پیار کے ساتھ) اُن کے چہرے پر پھینکی تھی، اس وقت ان کی عمر پانچ سال تھی۔ اسے بخاری (۷۷، ۱۸۹، ۱۱۸۵، ۶۴۲۲، ۶۳۵۴) نے روایت کیا ہے۔ وہ اس حدیث کے ذریعے سے حاضر ہونے اور سماع میں فرق کرتے تھے۔ ایک (بے سند) روایت میں آیا ہے کہ ان (سیدنا محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ) کی عمر چار سال تھی۔ بعض حفاظِ حدیث نے سنِ تمیز کو اس کا ضابطہ قرار دیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اگر وہ عام جانور اور گدھے میں فرق کر سکے (تو سماع صحیح ہے)

[دیکھئے الکفایہ (ص ۶۵ عن موسیٰ بن ہارون الحمال وسندہ صحیح)]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بیس سال کے بعد ہی سماع کرنا چاہیے۔ بعض نے کہا: دس (سال) اور بعض نے کہا: تیس (سال)

ان تمام کا دارومدار حالتِ تمیز پر ہے، جب بھی بچہ عقل مند ہو جائے تو اس کا سماع (حدیث سننا) لکھنا چاہیے۔

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے کہا: ہمیں ابراہیم بن سعید الجوہری سے یہ بات پہنچی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے چار سال کا بچہ دیکھا جسے اُٹھا کر مامون الرشید (ایک خلیفہ) کے پاس لایا گیا تھا، اس نے قرآن پڑھ لیا تھا اور رائے میں نظر رکھتا تھا اِلا یہ کہ اسے جب بھوک

لگتی تو رونے لگتا تھا۔! [1]

حدیث سننے اور حاصل کرنے کی آٹھ اقسام ہیں:

اول: سماع

یہ کہ (سامع) اُس سے سُنے جس نے اپنے حافظے یا اپنی کتاب سے سُنایا ہے۔

قاضی عیاض نے کہا: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایسی حالت میں سننے والا ''حدثنا'' (ہمیں حدیث بیان کی) ''أخبرنا'' (ہمیں خبر دی) ''أنبأنا'' (ہمیں خبر دی) ''سمعت'' (میں نے سنا) ''قال لنا'' (اس نے ہمیں کہا) ''ذکر لنا فلان'' (فلاں نے ہمیں بتایا) کہے۔ (الالماع ص ۶۹)

خطیب نے کہا: سب سے اعلیٰ عبارت ''سمعت'' ہے پھر ''حدثنا'' اور ''حدثني'' (اس نے مجھے حدیث بیان کی) ہے۔ (الکفایہ ص ۴۱۲، ۴۱۳)

(ابن الصلاح نے) کہا: کئی علماء مثلاً حماد بن سلمہ، ابن المبارک، ہشیم، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، یحییٰ بن یحییٰ التمیمی اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ اپنے استادوں سے سُنی ہوئی روایتیں صرف ''أخبرنا'' کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ (الکفایہ ص ۲۸۴، ۲۸۵)

ابن الصلاح نے کہا: ''حدثنا'' اور ''أخبرنا'' کو ''سمعتُ'' سے اعلیٰ ہونا چاہئے کیونکہ ''سمعت'' کی حالت میں ہوسکتا ہے کہ استاد کا یہ ارادہ نہ ہو کہ وہ اپنے شاگرد کو حدیث سُنائے جب کہ ''حدثنا'' اور ''أخبرنا'' میں یہ ارادہ شامل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

حاشیہ: میں (ابن کثیر) نے کہا: بلکہ اس حالت میں اعلیٰ عبارت ''حدثني'' ہے کیونکہ ''حدثنا'' اور ''أخبرنا'' میں یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے اُستاد نے شاگردوں کی کثرت میں اُسے سنانے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ واللہ اعلم

(۱) الکفایہ (ص ۶۴) اس روایت کی سند علی بن الحسن النجار (؟ توثیق نامعلوم) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

دوم: استاد کو حافظے یا کتاب سے پڑھ کر سُنانا

جمہور کے نزدیک اسے ''عرض'' کہتے ہیں۔ شاذ لوگوں کو چھوڑ کر جن کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جمہور کے نزدیک اس طریقے سے (حاصل شدہ) روایت بیان کرنا جائز ہے۔

علماء کی دلیل وہ حدیث ہے جسے (سیدنا) ضمام بن ثعلبہ (رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا اور وہ صحیح (بخاری: ٦٣) میں ہے۔

یہ (عرض) استاد کے بیان کردہ الفاظ سننے سے کم تر ہوتی ہے۔

مالک، ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب سے روایت ہے کہ وہ اس سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں برابر ہیں۔ اس بات کو اہلِ حجاز، اہل کوفہ، (امام) مالک اور ان کے مدنی اساتذہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور بخاری نے اسے اختیار کیا ہے۔

صحیح پہلی بات ہے (یعنی یہ کمتر ہے) اور اسی پر علمائے مشرق ہیں۔[1]

جب وہ اس سے حدیث بیان کرے تو کہے ''قرأت'' میں نے قراءت کی یا ''قرئ علٰی فلان و أنا أسمع فأقربه'' فلاں پر پڑھا گیا اور میں سُن رہا تھا تو انھوں نے اس کا اقرار کیا یا ''أخبرنا'' یا ''حدثنا قراءة علیه'' اور یہ واضح ہے۔

اور اگر اسے مطلقاً بیان کرے تو یہ بات مالک، بخاری، یحیٰی بن سعید القطان، زہری، سفیان بن عیینہ، عام حجازیوں اور کوفیوں کے نزدیک جائز ہے بلکہ بعض تو ایسی حالت میں ''میں نے سنا'' کہنا بھی جائز سمجھتے ہیں۔

احمد (بن حنبل)، نسائی، ابن المبارک اور یحیٰی بن یحیٰی التمیمی نے اس سے منع کیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ''أخبرنا'' کہنا جائز ہے اور ''حدثنا'' کہنا جائز نہیں ہے۔ یہی قول شافعی، مسلم، نسائی اور جمہور اہلِ مشرق کا ہے بلکہ یہی قول اکثر محدثین سے نقل کیا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے درمیان سب سے پہلے (عبداللہ) ابن وہب

---

(۱) مثلاً دیکھئے الکفایہ (ص ۲٦٦) عن ابراہیم بن سعد الزہری وسندہ صحیح۔

(المصری) نے فرق کیا ہے۔ شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے کہا: ابن وہب سے پہلے یہی قول ابن جریج اور اوزاعی کا ہے۔ عام اہلِ حدیث (محدثین) میں یہی قول مشہور ہے۔

فرع (۱): جب شیخ کے سامنے ایسے نسخے کو پڑھا جائے جو انھیں یاد ہو تو (بہت) اچھا (اور) مضبوط ہے اور اگر انھیں یاد نہ ہو تو قابلِ اعتماد نسخہ قابلِ اعتماد ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ یہی صحیح، مختار اور راجح ہے۔

کچھ لوگوں نے اس سے منع کیا ہے اور یہ (بہت) مشکل ہے۔

اگر پڑھنے والے کے پاس صرف ایک ہی قابلِ اعتماد نسخہ ہو تو بھی صحیح ہے۔

فرع (۲): جمہور کے نزدیک یہ شرط لگانا صحیح نہیں ہے کہ شیخ کے سامنے پڑھا جائے وہ زبان سے اس کا اقرار (ضرور) کریں بلکہ اُن کا سکوت یا اس پر (عدمِ انکار کی صورت میں) اقرار کافی ہے، دوسرے لوگ: ظاہریہ وغیرہ میں سے یہ کہتے ہیں کہ اس کا زبانی اقرار ضروری ہے۔ شیخ ابواسحاق الشیرازی، ابن الصباغ اور سلیم (بن ایوب) الرازی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ ابن الصباغ نے کہا: جب زبان سے اقرار نہ کرے تو روایت جائز نہیں ہے لیکن اس پر عمل جائز ہے۔!

فرع (۳): ابن وہب اور حاکم نے کہا: جس شخص کو شیخ اکیلے تنہائی میں سُنائے تو وہ "حدثني" کہے اور اگر اس کے ساتھ دوسرے شاگرد بھی ہوں تو "حدثنا" کہے۔ اگر وہ خود اکیلے شیخ کو سُنائے تو "أخبرني" کہے اور اگر اس کے ساتھ دوسرے بھی ہوں تو "أخبرنا" کہے۔

(قول الحاکم: معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۲۶۰، قول ابن وہب: العلل الصغیر للترمذی ۷۵۲/۵، الملحق، دوسرا نسخہ طبع دار السلام ص ۸۹۶، وسندہ حسن)

ابن الصلاح نے کہا: یہ اچھی بہترین بات ہے۔

اگر شک ہو جائے تو ثابت شدہ صیغۂ واحد استعمال کرے اور وہ ابن الصلاح و بیہقی کے نزدیک "حدثني" یا "أخبرني" ہے۔

یحییٰ بن سعید القطان سے روایت ہے کہ ادنیٰ صیغہ یعنی "حدثنا" یا "أخبرنا" کہے۔

خطیب بغدادی نے کہا: ابن وہب نے جو یہ بات کہی ہے وہ مستحب ہے لیکن تمام علماء کے نزدیک ضروری نہیں ہے۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۲۲۳)

فرع (۴): جو شخص شیخ سے سماع کے وقت لکھ رہا یا سنا رہا ہو تو اس کے سماع کے صحیح ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابراہیم الحربی، ابن عدی (الجرجانی) اور ابواسحاق الاسفرائنی اسے ممنوع سمجھتے ہیں۔ ابوبکر احمد بن اسحاق الصبغی نے کہا: یہ شخص ''میں حاضر تھا'' کہے اور ''حدثنا'' و''أخبرنا'' نہ کہے۔ موسیٰ بن ہارون اسے جائز سمجھتے تھے۔

ابن المبارک اس وقت (بھی) لکھتے رہتے تھے جب انھیں حدیثیں پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔
(الکفایہ للخطیب ص ۶۷ وسندہ ضعیف، فیہ احمد بن موسیٰ/ابن المبارک سے یہ عمل ثابت نہیں ہے)

ابو حاتم (الرازی) نے کہا: میں نے (محمد بن الفضل السدوسی) عارم کے پاس حدیث لکھی اور وہ پڑھ رہے تھے اور میں نے عمرو بن مرزوق کے پاس حدیث لکھی اور وہ پڑھ رہے تھے۔ (الکفایہ ص ۶۷، تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۶۷ وسندہ صحیح)

(امام) دارقطنی جوانی میں اسماعیل (بن محمد) الصفار کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ وہ حدیثیں لکھوا رہے تھے اور دارقطنی کچھ اجزاء نقل کر رہے تھے۔ بعض حاضرین نے دارقطنی سے کہا: آپ کا سماع صحیح نہیں ہے، آپ تو (کچھ اور) لکھ رہے ہیں؟ دارقطنی نے کہا: املاء کے دوران میں آپ کا فہم میرے فہم جیسا نہیں ہے۔ پھر پوچھا: شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں لکھوائی ہیں؟ پھر دارقطنی نے فرمایا: شیخ نے اٹھارہ (۱۸) حدیثیں لکھوائی ہیں۔ انھوں نے یہ ساری کی ساری روایتیں اسانید اور متون کے ساتھ زبانی سُنا دیں تو لوگ اس (عظیم الشان حافظے) سے بہت حیران ہوئے۔ (تاریخ بغداد ۱۲/ ۳۶ وسندہ ضعیف، قال الازہری: بلغنی الخ)

میں (ابن کثیر) نے کہا: ہمارے شیخ حافظ ابوالحجاج المزی رحمہ اللہ مجلسِ سماع میں لکھتے رہتے تھے اور بعض اوقات انھیں اُونگھ بھی آجاتی تھی مگر قراءت کرنے والے کی غلطی پر واضح طور پر بہت اچھے طریقے سے ٹوک دیتے تھے۔ قاری (پڑھنے والا) حیران ہوتا تھا کہ وہ بیدار ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب میں غلطی کر جاتا ہے اور شیخ اُونگھنے

کے باوجود اس کتاب پر بہت زیادہ متنبہ ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: اسی طرح مجلسِ سماع میں حدیثیں بیان کرنا (باتیں کرنا) اور اگر قاری جلدی جلدی قراءت کرنے والا ہو یا سننے والا قاری سے دور ہو (تو کیسا ہے)؟

پھر انھوں نے اس بات کو اختیار کیا کہ اس طرح کی معمولی باتیں قابلِ معافی ہیں۔

اگر وہ لکھنے کے ساتھ جو پڑھا جا رہا ہے سمجھتا ہو تو سماع صحیح ہے۔

بہتر یہ ہے کہ وہ اس سب کو بطورِ اجازت بیان کرے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ہمارے زمانے میں یہی ہو رہا ہے۔ مجلسِ سماع میں سمجھنے والے اور نہ سمجھنے والے، قاری سے دور، اُونگھنے والے، باتیں کرنے والے اور ایسے بچے حاضر ہوتے ہیں جن پر کنٹرول نہیں ہوسکتا بلکہ وہ عام طور پر کھیلتے رہتے ہیں اور صرف سماع میں مشغول نہیں رہتے۔

ان سب کے لئے ہمارے شیخ حافظ ابوالحجاج المزی رحمہ اللہ کے سامنے سماع لکھا جاتا تھا۔

مجھے قاضی تقی الدین سلیمان المقدسی (متوفی ۷۱۵ھ) کی بات پہنچی ہے کہ اُن کی مجلس میں بچوں کو کھیلنے سے ڈانٹا گیا تو انھوں نے کہا: انھیں نہ ڈانٹو، ہم نے بھی انھی کی طرح سُنا تھا۔

مشہور امام عبدالرحمٰن بن مہدی سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: تیرے لئے حدیث کا سونگھنا کافی ہے۔ (؟)

اسی طرح اور بہت سے حفاظ نے کہا ہے۔

بغداد اور دوسرے شہروں میں مجلسیں منعقد کی جاتیں تو لوگ گروہ در گروہ بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہوتے۔ مستملی (شیخ کی حدیثیں لوگوں کو سُنانے اور املاء کرانے والے) اونچی جگہوں پر چڑھ جاتے۔ مشائخ جو لکھواتے تو اسے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ لوگ ان سے سُن کر یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان مجالس میں فضول باتیں اور شور بھی ہوتا تھا۔

اعمش نے بیان کیا کہ وہ ابراہیم (بن یزید النخعی) کے حلقے میں تھے، جب کوئی آدمی

کسی بات کو اچھی طرح نہ سن پاتا تو اپنے ساتھی سے پوچھ لیتا تھا۔

(الکفایہ ص ۷۲ وسندہ ضعیف، حبان بن علی العنزی ضعیف)

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں (سیدنا) عقبہ بن عامر اور (سیدنا) جابر بن سمرہ وغیرہما (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی بعض احادیث میں واقع ہوئی ہیں۔

(دیکھئے صحیح مسلم: ۲۳۴، ۱۸۲۱)

اور یہی بات لوگوں کے لئے زیادہ مناسب ہے اگرچہ دوسرے (بعض) علماء نے اس میں احتیاط اور تشدد سے کام لیا ہے اور یہی قیاس ہے۔ واللہ اعلم

فرع (۵): پردے کے پیچھے سے سماع (احادیث سننا) جائز ہے جیسے اسلاف تابعین نے امہات المومنین سے روایات لی ہیں۔

بعض لوگوں نے ''حتیٰ کہ ابن ام مکتوم اذان دیں'' (البخاری: ۵۹۲ و مسلم: ۱۰۹۲) والی حدیث سے دلیل لی ہے۔

بعض نے شعبہ سے نقل کیا ہے کہ تمھیں اگر کوئی ایسا شخص حدیث بیان کرے جس کی شخصیت تم نہ دیکھتے (یا دیکھ سکتے) ہو تو اس سے روایت نہ کرو، ہوسکتا ہے کہ یہ شیطان کسی صورت میں متمثل ہو کر ''حدثنا، أخبرنا'' کہہ رہا ہو۔ (المحدث الفاصل ص ۵۹۹ فقرہ: ۸۶۲ وسندہ ضعیف، ابو حفص الواسطی کی توثیق نا معلوم ہے۔ و من طریقہ الالماع ص ۱۳۷، دوسرا نسخہ ص ۱۰۲)

یہ بہت عجیب و غریب قول ہے۔

فرع (۶): جب استاد اپنے شاگرد کو کوئی حدیث سنائے پھر کہے: ''اسے مجھ سے روایت نہ کرنا'' یا ''میں نے تجھے حدیث سنانے سے رجوع کرلیا ہے'' یا اس قسم کے الفاظ کہے۔ سوائے خشک (نری) ممانعت کے کوئی (معقول) وجہ بیان نہ کرے۔ یا بعض لوگوں کو حدیث سناتے وقت اُن میں سے بعض کی تخصیص کرے اور کہے: ''میں فلاں کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ مجھ سے کچھ بیان کرے۔'' یہ باتیں اس سے روایت کرنے کے صحیح ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہیں اور اس کی ممانعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

ایسی حالت میں نسائی نے (شیخ) حارث بن مسکین سے روایتیں بیان کی ہیں اور شیخ ابواسحاق الاسفرائنی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

سوم: اجازت

اس سے روایت جمہور کے نزدیک جائز ہے اور قاضی ابوالولید الباجی نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

ابن الصلاح نے اس دعوے کو یہ کہہ کر توڑ دیا ہے کہ ربیع (بن سلیمان المرادی) نے شافعی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے روایت بالاجازت سے منع کیا ہے۔

(دیکھئے الکفایہ ص ۳۱۷، وسندہ صحیح)

ماوردی نے یہی فیصلہ کیا ہے اور اسے مذہبِ شافعی کی طرف منسوب کیا ہے۔

(دیکھئے ادب القاضی ۱/۳۸۸)

اسی طرح قاضی حسین بن محمد المروروذی صاحب "التعلیقة" نے اس سے منع کیا ہے۔
ان دونوں نے کہا: "اگر روایت بالاجازہ جائز ہوتو (احادیث کے سماع کے لئے) سفر کرنا باطل ہوجاتا ہے۔"
اسی طرح (امام) شعبہ بن الحجاج وغیرہ ائمہ حدیث وحفاظِ حدیث سے مروی ہے۔[1]

(دیکھئے الکفایہ ص ۳۱۶)

اجازت کو ابراہیم الحربی، ابوالشیخ عبداللہ بن محمد بن جعفر الاصبہانی اور ابونصر الوائلی السجزی نے باطل قرار دیا ہے اور سجزی نے اپنے استادوں کی ایک جماعت سے اسے نقل کیا ہے۔ پھر اجازت کی (کئی) قسمیں ہیں:
اولاً: کسی متعین شخص کا کسی متعین چیز کے بارے میں کسی متعین شخص کو اجازت دینا مثلاً

....

(۱) معلوم ہوا کہ روایت بالاجازت کے جائز ہونے پر اجماع کا دعویٰ باطل ہے لیکن جمہور کا یہی قول ہے کہ یہ جائز ہے اور یہی راجح وصواب ہے۔

وہ یہ کہے:

''میں نے تجھے یہ اجازت دی ہے کہ تو مجھ سے یہ کتاب یا یہ کتابیں روایت کرے۔''

اسے مناولہ بھی کہتے ہیں اور جمہور علماء حتیٰ کہ ظاہر یہ کے نزدیک بھی یہ جائز ہے لیکن انھوں نے اس پر عمل کے بارے میں مخالفت کی ہے۔ اس میں چونکہ سماع متصل نہیں لہٰذا وہ اسے مرسل کی طرح سمجھتے ہیں۔

ثانیاً: کسی متعین شخص کا کسی غیر متعین چیز کے بارے میں اجازت دینا۔ مثلاً وہ یہ کہے: ''میں نے تجھے یہ اجازت دی ہے کہ تو مجھ سے میری مرویات بیان کرے'' یا ''تیرے نزدیک میری جو روایتیں اور کتابیں صحیح ثابت ہوں (تو انھیں بیان کر)''

اسے بھی جمہور علماء روایات اور عمل کے لحاظ سے جائز سمجھتے ہیں۔

ثالثاً: غیر معین کے لئے اجازت مثلاً یہ کہے کہ ''میں نے تمام مسلمانوں کو اجازت دے دی ہے کہ وہ مجھ سے روایت کریں۔'' یا ''تمام موجودہ لوگوں'' یا ''جو لا الٰہ الا اللہ'' کہے اسے اجازت دے دی ہے۔ اسے اجازتِ عامہ کہتے ہیں۔

حفاظ و علماء کی ایک جماعت نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اسے خطیب بغدادی اور ان کے استاد قاضی ابو الطیب الطبری نے بھی جائز قرار دیا ہے۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۴۶۶، دوسرا نسخہ ص ۳۲۵)

اسے ابوبکر الحازمی نے اپنے شیخ ابو العلاء الہمدانی الحافظ اور مغربی (اندلسی) محدثین رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے۔[1]

رہی مجہول کی اجازت یا مجہول کے ذریعے سے اجازت تو یہ فاسد ہے۔ اس میں سے وہ اجازت نہیں ہے جو اجازت دینے والا ایک خاص جماعت کو دیتا ہے، جن کے اسباب اور تعداد وہ نہیں جانتا کیونکہ یہ تو جائز اور مشہور ہے جس طرح کہ حدیث سنانے والے کو حاضرینِ مجلس کے انساب اور تعداد معلوم نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

(۱) قولِ راجح میں ایسی مجہول و غیر معین اجازت حجت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اور اگر کہے کہ ''میں نے اس کتاب کی روایت بیان کرنے کی اسے اجازت دی ہے جو مجھ سے روایت کرنا پسند کرتا ہے'' تو اسے ابوالفتح محمد بن الحسین الازدی (حافظ ضعیف جداً متہم بالوضع) نے لکھا ہے اور دوسروں نے جائز قرار دیا ہے۔ ابن الصلاح نے اسے قوی قرار دیا ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہے: ''میں نے تجھے، تیری اولاد، تیری نسل اور تیرے بعد میں آنے والوں کو اس کتاب کی روایت کی اجازت دی۔'' یا ''میرے لئے جو روایت جائز ہے'' (اس کی اجازت انھیں دی) تو اسے ایک جماعت نے جائز قرار دیا ہے۔ ان میں سے ابوبکر بن ابی داود السجستانی (حافظ صدوق حسن الحدیث) ہیں، انھوں نے ایک آدمی کو کہا:

''میں نے تجھے، تیری اولاد اور جو پیدا ہوں گے انھیں اجازت دے دی ہے۔''

(الکفایہ ص ۴۶۵، دوسرا نسخہ ص ۳۲۵ وسندہ صحیح)

اگر یہ کہے کہ ''فلاں قبیلے میں سے جو موجود ہیں یا ہوں گے میں نے انھیں اجازت دی'' خطیب نے اس کا جواز قاضی ابویعلیٰ ابن الفراء الحنبلی اور ابوالفضل بن عمروس المالکی سے نقل کیا ہے۔

اور ابن الصباغ نے اسے ایک گروہ سے نقل کر کے ضعیف قرار دیا اور کہا: یہ اس پر مبنی ہے کہ اجازت اذن یا مُحادثہ (باہم مکالمہ) ہے۔

اسی طرح ابن الصلاح نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

انھوں نے چھوٹے بچے جس سے باتیں نہیں کی جاتیں، کی اجازت کا ذکر کیا ہے۔

خطیب نے کہا کہ انھوں نے قاضی ابوالطیب سے کہا: ہمارے بعض ساتھی کہتے ہیں کہ صرف اسی کی اجازت صحیح ہے جس کا سماع صحیح ہے؟ تو انھوں نے کہا: غائب کو بھی اجازت دی جاتی ہے حالانکہ اس کا سماع صحیح نہیں ہوتا۔ پھر خطیب نے چھوٹے بچے کی اجازت کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا: ہم نے اپنے تمام استادوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ وہ بچوں کو ان کی عمریں پوچھنے کے بغیر ہی اجازت دے دیتے تھے اور ہم نے نہیں دیکھا کہ انھوں نے کسی ایسے شخص کو اجازت دی ہو جو اس وقت موجود نہیں تھا۔ واللہ اعلم (الکفایہ ص ۳۲۵، ۳۲۶)

اگر کہے" میں تجھے اس کی اجازت دیتا ہوں جو تو نے مجھ سے اچھی طرح سُنا ہے اور اس کی بھی اجازت دیتا ہوں جو میں سُناؤں گا" اس میں پہلا بہتر اور دوسرا فاسد ہے۔

ابن الصلاح نے اس (دوسری چیز) کی دلیل نکالنے کی کوشش کی کہ اجازت بھی وکالت کی طرح ایک اذن ہے۔

لہٰذا اگر کہے: "میں جس چیز کا مالک بنوں گا اُس کے بیچنے کی وکالت تجھے دیتا ہوں" اس میں اختلاف ہے۔ رہی اس کی اجازت جو خود اسے بطریقۂ اجازت حاصل ہے تو جمہور نے اجازت پر اجازت کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ کئی ہوں۔ دارقطنی، ان کے استاد ابوالعباس ابن عقدہ (رافضی، چور)، حافظ ابونعیم الاصبہانی اور خطیب وغیرہ علماء نے اسے جائز کہا ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: اس سے بعض اُن متاخرین نے منع کیا ہے جس کا کوئی شمار نہیں کیا جاتا۔

صحیح یہ ہے کہ اس پر عمل جائز اور علماء نے اس کی تشبیہ وکیل مقرر کرنے سے دی ہے۔

چہارم: مُناولہ

اگر اس کے ساتھ اجازت (بھی حاصل) ہو جیسے اپنی سُنی ہوئی کوئی کتاب طالب علم کو دے اور اسے کہے: "اسے مجھ سے روایت کرو۔" وہ کتاب اسے ہبہ کر دے یا عاریتاً دے دے تا کہ وہ اس سے نقل کر کے اسے لوٹا دے یا طالب علم اُستاد کے سماع والی کتاب لے آئے۔ استاد اسے کھول کر غور سے دیکھے اور پھر کہے: "اسے مجھ سے روایت کرو۔" اسے عرض المناولہ کہتے ہیں۔ (۱)

حاکم (نیشاپوری) نے کہا: بہت سے متقدمین کے نزدیک یہ سماع کے قائم مقام ہے۔ انھوں نے اسے اہلِ مدینہ میں سے مالک، زہری، ربیعہ (بن ابی عبدالرحمٰن) اور یحییٰ بن سعید الانصاری، اہلِ مکہ میں سے مجاہد، ابوالزبیر اور سفیان بن عیینہ، اہلِ کوفہ میں سے علقمہ، ابراہیم (نخعی) اور شعبی، اہلِ بصرہ میں سے قتادہ، ابوالعالیہ اور ابوالمتوکل الناجی، اہلِ مصر میں

(۱) پیش کرنا، مُناولہ: کوئی چیز دینا۔

سے عبداللہ بن وہب ، عبدالرحمٰن بن القاسم اور اشہب ، اہلِ شام اور اہلِ عراق اور اپنے اساتذہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۶۰)

ابن الصلاح نے کہا: انھوں نے اپنے کلام میں عرضِ مناولہ کو عرضِ قراءت سے خلط ملط کر دیا ہے۔ پھر حاکم نے کہا: جمہور فقہاء اسلام جو حلال وحرام کے بارے میں فتوے دیتے تھے وہ اسے سماع نہیں سمجھتے اور یہی قول: شافعی، ابوحنیفہ، احمد (بن حنبل)، اسحاق (بن راہویہ)، ثوری، اوزاعی، ابن المبارک، یحییٰ بن یحییٰ، بُویطی اور مُزَنی کا ہے۔ ہمارے ائمہ کرام اسی پر گامزن تھے۔ ہم نے انھیں اسی پر پایا ہے اور ہم اسی کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم

(معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۶۰، دوسرا نسخہ ص ۱۹۱، ۱۹۲، تیسرا نسخہ ص ۲۷۸، ۲۷۹)

اگر شیخ اسے کتاب ہبہ نہ کرے اور نہ عاریتاً دے تو یہ سابقہ درجے سے نیچے ہے بلکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ تو صرف اجازت ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اگر کتاب صحیح بخاری، صحیح مسلم یا دوسری مشہور کتابوں کی طرح مشہور ہو تو یہ اسی طرح ہے جیسے وہ اپنی کتاب اُس کی ملکیت میں یا عاریتاً دے دے۔ واللہ اعلم

اگر اذن (اجازت) کے بغیر صرف مناولہ ہو تو مشہور یہ ہے کہ اس سے روایت جائز نہیں ہے۔ خطیب نے بعض سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔ (الکفایہ ص ۳۲۱)

ابن الصلاح نے کہا: اگر شیخ بتا دے کہ یہ (کتاب) اس کا سماع ہے یعنی اُس نے سُنی ہے تو بعض لوگ مجرد اس وجہ سے روایت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

اجازت والی روایت میں راوی کو "أنبأنا" کہنا چاہئے اور اگر وہ " أنبأنا اجازةً " کہہ دے تو یہ بہت بہتر ہے۔

متقدمین کی ایک جماعت کے نزدیک "أنبأنا" اور "حدثنا" کہنا جائز ہے۔

ایک جماعت کا یہ قول گزر چکا ہے کہ عرضِ مناولہ کے ساتھ اگر اجازت بھی ہو تو یہ سماع کے قائم مقام ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی اشکال کے "حدثنا" اور "أخبرنا" کہتے ہیں۔

قدیم وجدید زمانے کے محدثین کے نزدیک "حدثنا" اور "أخبرنا" (اجازت کی)

قید کے بغیر مطلق بیان کرنا جائز نہیں ہے۔ اوزاعی اجازت کے لئے "خبرنا" کا خاص لفظ استعمال کرتے تھے۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۳۰۲، ۳۳۰)

پنجم: مُکاتبہ

اگر کوئی شخص اپنی حدیثوں میں سے کچھ لکھ کر کسی کی طرف بھیج دے تو اسے مکاتبہ کہتے ہیں۔

اور اگر اس کے ساتھ روایت کی اجازت بھی دے دے تو اس مناولہ کے قائم مقام ہے جس کے ساتھ اجازت بھی موجود ہے۔

اگر اس کے ساتھ اجازت نہ ہو تو ایوب (سختیانی)، منصور، لیث (بن سعد) اور کئی شافعی فقہاء وعلمائے اصول نے ایسی روایت کو جائز قرار دیا ہے اور یہی مشہور ہے۔ وہ اسے مجرد اجازت سے زیادہ قوی سمجھتے ہیں۔

ماوردی اسے ممنوع سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم (دیکھئے ادب القاضی للماوردی ۳۸۹/۱)

لیث (بن سعد) اور منصور مکاتبہ میں "أخبرنا" اور "حدثنا" کہنا جائز سمجھتے ہیں (حالانکہ) بہتر اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس میں مکاتبت کی صراحت کی جائے۔

ششم: اعلام الشیخ [شیخ کا اطلاع دینا]

اگر شیخ کسی کو یہ بتا دیں کہ یہ کتاب انھوں نے فلاں سے سُنی ہے لیکن وہ اسے روایت کی اجازت نہ دیں تو اسے "اعلام الشیخ" کہتے ہیں۔

صرف اس کے ساتھ بھی محدثین وفقہاء کے بعض گروہوں مثلاً ابن جریج نے روایت کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن الصباغ اور متاخرین نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض ظاہریوں نے کہا ہے: اگر وہ اسے (اپنا سماع) بتا دے اور روایت کرنے سے منع کر دے تو اُس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس سے روایت کرے۔ یہ اُسی طرح ہے کہ شیخ اپنی زبانی بیان کردہ روایت سے شاگرد کو منع کر دے تو اس کے لئے اسے بیان کرنا جائز ہے۔

ہفتم: وصیت

وصیت اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے لئے اپنی کتاب کی وصیت کر جائے گویا کہ وہ کسی شخص کے لئے روایت کر رہا ہے۔

بعض اسلاف نے اس شخص کو اس کتاب کے روایت کرنے کی وصیت کرنے والے سے روایت کی اجازت دی ہے جس کے بارے میں وصیت کی گئی ہے۔ انھوں نے اسے مناولہ اور روایت کی اطلاع سے تشبیہ دی ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: یہ دور کی بات ہے۔ یہ عالم یا متأول کی غلطی ہے اِلا یہ کہ انھوں نے اس سے وجادہ والی روایت مراد لی ہو۔ واللہ اعلم (۱)

ہشتم: وجادہ

اس کی صورت (اور تعریف) یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی لکھی ہوئی حدیث یا کتاب پالے۔ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بطورِ حکایت نقل کرے اور کہے: ''میں نے فلاں کے خط سے لکھا ہوا پایا کہ ہمیں فلاں نے حدیث بیان کی'' اور آخر تک سند و متن بیان کر دے۔

اس قسم کی روایتیں مسند الامام احمد میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ امام احمد کے بیٹے عبداللہ (بن احمد بن حنبل) کہتے ہیں: میں نے اپنے ابا کے خط سے لکھا ہوا پایا: ہمیں فلاں نے حدیث بیان کی...... '' اور (پھر) وہ حدیث بیان کرتے ہیں۔

اس شیخ کے لئے یہ کہنا بھی جائز ہے کہ ''فلاں نے کہا'' بشرطیکہ اس میں تدلیس نہ ہو جس سے ملاقات (اور سماع) کا وہم ہو جائے۔

ابن الصلاح نے کہا: بعض لوگوں نے یہ زیادتی کی ہے کہ اس حالت میں مطلق طور پر ''حدثنا'' اور ''أخبرنا'' کہہ دیا ہے جس کی وجہ سے ایسا کرنے والے پر تنقید کی گئی ہے۔

---

(۱) بعض علماء نے ابن الصلاح کے قول کو ''دور کی بات'' قرار دیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وصیت مناولہ بالا جازت کی قسم ہے۔ واللہ اعلم

اگر کوئی شخص اپنے شیخ کے خط کے بغیر ان کی کتابوں میں سے پائے تو کہے: ''فلاں نے ذکر کیا'' یا ''فلاں نے کہا'' یا ''مجھے فلاں سے یہ روایت پہنچی'' یہ اس کتاب کے بارے میں ہے جس کے بارے میں یہ ثابت نہ ہو کہ یہ شیخ کی کتاب ہے یا شیخ کی کتاب کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کیا گیا ہو۔ واللہ اعلم

میں (ابن کثیر) نے کہا: وجادہ روایت کے باب میں سے نہیں ہے یہ تو اس کی حکایت ہے کہ اس نے کتاب میں لکھا ہوا پایا ہے۔

رہا اس کے ساتھ عمل تو بہت سے یا اکثر فقہاء ومحدثین نے اس سے منع کیا ہے جیسا کہ بعض نے اُن سے نقل کیا ہے۔ (مثلاً دیکھئے الارشاد للخلیلی ۲/۴۲۳)

شافعی اور اصحابِ شافعی کے ایک گروہ سے اس پر عمل کا جواز مروی ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: بعض محققینِ اصحابِ شافعی نے اصول میں اس پر وجوبِ عمل کا فیصلہ کیا ہے جب اس پر اعتماد حاصل ہو جائے۔

ابن الصلاح نے کہا: ان متأخر (بعد والے) زمانوں میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں روایت کی شرطیں (عام طور پر) ناممکن الحصول ہیں۔ یعنی مجرد وجادات ہی رہ گئے ہیں۔

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں: نبی ﷺ سے حدیث مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگوں میں تمھیں کس کا ایمان زیادہ پسند ہے؟ لوگوں نے کہا: فرشتوں کا۔ آپ نے فرمایا: وہ کیوں نہ ایمان لائیں وہ تو رب کے پاس ہیں؟ لوگوں نے انبیاء (کے ایمان) کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ کیوں ایمان نہ لائیں جبکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ صحابہ نے کہا: تو پھر (کیا) ہم مراد ہیں؟

آپ نے فرمایا: تم کیسے ایمان نہ لاؤ جبکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں؟

صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! پھر یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمھارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو صحیفے (لکھی ہوئی کتابیں) پائیں گے تو ان پر ایمان لے آئیں گے۔

ہم نے اس حدیث کو سند و متن کے ساتھ صحیح بخاری کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ (معتبر) کتابوں کو مجرد وجادت کے ساتھ پانے پر عمل کرنا اچھی بات ہے۔ واللہ اعلم (۲)

(۲۵) پچیسویں قسم: کتابتِ حدیث، اس کا ضبط اور اندراج

صحیح مسلم (ح ۳۰۰۴) میں (سیدنا) ابو سعید (الخدری رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہے تو وہ اسے مٹا دے۔

ابن الصلاح نے کہا: (سیدنا) عمر، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابوموسیٰ (الاشعری) اور ابو سعید (الخدری) وغیرہم صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور (ان کے بعد) تابعین (رحمہم اللہ) سے اس (کتابتِ حدیث) کی کراہت مروی ہے۔ (سیدنا) علی، حسن بن علی، انس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہم صحابہ اور (ان کے بعد) تابعین سے لکھائی یا اس کا جواز مروی ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوشاہ کے لئے (میرا خطبہ) لکھو۔ (صحیح بخاری: ۱۱۲، ۲۴۳۴، ۶۸۸۰ و صحیح مسلم: ۱۳۵۵)

اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب "المقدمات" کے شروع میں لکھی ہے۔ وللہ الحمد

بیہقی اور ابن الصلاح وغیرہما نے کہا: ہوسکتا ہے کہ یہ ممانعت اس وقت تھی جب قرآن کے ساتھ اس کے التباس (گڈمڈ ہونے) کا ڈر تھا اور جب یہ خوف ختم ہوا تو اجازت دے دی گئی۔ واللہ اعلم (دیکھئے المدخل للبیہقی ص ۴۱۰، علوم الحدیث لابن الصلاح ص ۱۶۰)

علمائے کرام نے بعد والے ادوار میں کتابتِ حدیث کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے اور

....

(۱) میرے نزدیک یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے۔

دیکھئے حاشیہ اختصار علوم الحدیث (۱/۳۶۹۔۳۷۰) اور المستدرک (۴/۸۵ ح ۶۹۹۳) وغیرہما

(۲) حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان کے بعد والے لوگوں کو صرف اس لحاظ سے ترجیح حاصل ہے کہ وہ لکھی ہوئی کتابوں پر عمل کریں گے۔ مطلق ترجیح حاصل نہیں ہے۔ دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۱/۶۶

یہی بات بغیر کسی انکار کے (ہمارے زمانے میں) جاری وساری اور مشہور ہے۔

جب یہ بات مقرر ہوگئی تو حدیث اور دوسرے علوم لکھنے والے کو چاہئے کہ اصل کتاب میں طالب علموں وغیرہ پر مشکل الفاظ کو عام لوگوں کی اصطلاح کے مطابق نقطوں، شکل اور اعراب میں ضبط کر کے لکھے اور اگر حاشیے پر لکھ دے تو (بھی) اچھا ہے۔

اسے واضح (اور صاف) لکھنا چاہئے۔ بغیر عذر کے باریک لکھنا اور حروف کو ایک دوسرے سے ملا کر گڈ مڈ کر دینا مکروہ ہے۔ امام احمد (بن حنبل) نے اپنے چچازاد بھائی حنبل (بن اسحاق) کو باریک خط لکھتے دیکھا تو فرمایا: ایسا نہ کر، ایک دن (بڑھاپے اور ضعفِ بصارت کے وقت) اس کا محتاج ہوگا تو یہ تجھے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ (۱)

ابن الصلاح نے کہا: ہر دو حدیثوں کے درمیان گول دائرہ بنا دینا چاہئے۔ یہ بات ہمیں ابوالزناد، احمد بن حنبل، ابراہیم الحربی اور ابن جریر الطبری سے پہنچی ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: میں نے یہ بات (گول دائرہ) امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کے خط میں دیکھی ہے۔ خطیب بغدادی نے کہا: دائرے کو خالی چھوڑنا چاہئے پھر جب اس کی مراجعت کرے تو اس میں نقطہ لگا دے۔ (۲)

ابن الصلاح نے کہا: عبداللہ بن فلان اس طرح لکھنا کہ ایک سطر کے آخر میں ''عبد'' اور دوسری سطر کے شروع میں ''اللہ'' ہو ایسا لکھنا مکروہ ہے بلکہ ''عبداللہ'' کو ایک سطر میں اکٹھا لکھنا چاہئے۔

انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کے رسول پر درود کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اگر یہ بار بار بھی ہو تو لکھنے سے نہیں اُکتانا چاہئے کیونکہ اس میں بہت بڑا ثواب ہے۔

....

(۱) الجامع فی اخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب: ۵۴۷ وسندہ صحیح، محمد بن الحسن (ھو ابن الحسین) الآجری ثقہ امام

(۲) الجامع فی اخلاق الراوی وآداب السامع (۱/۲۷۳)

میرے پاس مسندِ حمیدی کے جس قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ ہے اس میں ہر حدیث کے آخر میں دائرہ بنا ہوا ہے اور ان دائروں میں نقطے لگے ہوئے ہیں یعنی یہ صحیح ترین اور مراجعت والا نسخہ ہے۔ والحمدللہ

انھوں نے فرمایا: امام احمد وغیرہ کے لکھے ہوئے خط میں جہاں درود نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے (جیسی سُنی ویسی) روایت مراد لی ہے۔

خطیب نے کہا: مجھے پتا چلا ہے کہ وہ (احمد بن حنبل بعض اوقات) نبی ﷺ پر زبانی درود پڑھتے تھے اور لکھتے نہیں تھے۔

ابن الصلاح نے کہا: درود وسلام کو مکمل لکھنا چاہئے نہ کہ کم (یا) اشارے میں لکھنا اور صرف ''علیہ السلام'' پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ مکمل اور واضح طور پر ''ﷺ'' لکھنا چاہئے۔ (1)

انھوں (ابن الصلاح) نے کہا: اپنی اصل (کتاب) کا دوسری قابلِ اعتماد اصل (کتاب) سے مقابلہ کرنا چاہئے، خود بھی اور دوسرے کے ساتھ بھی جو قابلِ اعتماد حافظ ہو۔ بعض لوگ تشدد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صرف خود ہی اکیلے مقابلہ (دونوں نسخوں کی باہم مراجعت) کرے گا حالانکہ یہ بات غلط اور مردود ہے۔

شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے یہاں تخریج (غلطیاں نکالنے) تضبیب (مراجعت) کے بعد لفظ پر ص یا ض وغیرہ لکھنا (تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ لفظ اسی طرح مروی ہے اور اس میں خطا یا کچھ رہ جانے کا احتمال ہے) اور تصحیح (اصلاح) وغیرہ عام وخاص اصطلاحات سے متعلقہ اُمور پر بہت زیادہ تفصیل سے کلام کیا ہے۔ انھوں نے دوسندوں کے درمیان ''ح'' مہملہ پر کلام کیا ہے کہ یہ تحویل، دوسندوں کے درمیان حائل یا الحدیث سے ماخوذ ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: بعض لوگوں کو یہ وہم ہے کہ یہ ''خ'' معجمہ ہے یعنی دوسری سند۔

---

(1) معلوم ہوا کہ جو لوگ صرف ''ص'' یا ''صلعم'' وغیرہ لکھتے ہیں ان کا یہ عمل غلط ہے۔

فائدہ: بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ ﷺ لکھنا ثابت نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، تبع تابعین اور محدثین وعلماء آپ کے نام کے ساتھ ﷺ لکھتے تھے جیسا کہ حدیث کی کتابوں اور قدیم ترین مخطوطات سے ثابت ہوتا ہے بلکہ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' فینزل عیسی بن مریم ﷺ ...'' الخ

دیکھئے صحیح مسلم (درسی نسخہ ج ۲ ص ۳۹۲ ح ۲۸۹۷، عربی نسخہ ج ۴ ص ۲۲۲۱، مطبوعہ دارالسلام ص ۱۲۵۴)

پہلی بات ہی مشہور ہے اور بعض نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

(مثلاً دیکھئے شرح النووی علیٰ صحیح مسلم ۳۸/۱)

(۲۶) چھبیسویں قسم: صفتِ روایتِ حدیث

ابن الصلاح نے کہا: ایک قوم نے روایت میں تشدد کیا ہے، اُن میں سے بعض نے یہ شرط لگائی ہے کہ روایت حفظِ راوی یا اس کے مذاکرے سے ہو، انھوں (ابن الصلاح) نے مالک، ابوحنیفہ اور ابوبکر الصیدلانی (محمد بن داود بن محمد) المروزی سے نقل کیا ہے۔(۱)

جمہور کے نزدیک یہی کافی ہے کہ راوی کا سُنی ہوئی چیز کے بارے میں سماع ثابت ہو، اگر یہ دوسرے کے خط سے ہو یا نسخہ غائب (دُور یا گم) ہو جائے، اگر ظن غالب ہو کہ یہ تبدیلی اور تغیر سے محفوظ ہے (تو اس کی روایت جائز ہے۔)

بعض دوسرے لوگوں نے ایسے نسخوں کے بارے میں صرف طالب علم کے قول: ''یہ آپ کی روایت میں سے ہے''؟ پر تحقیق، نسخہ دیکھنے اور سماع تلاش کرنے کے بغیر اعتماد کرتے ہوئے تساہل (نرمی) اختیار کر کے روایت کی اجازت دی ہے، جن نسخوں کا مقابلہ نہیں کیا گیا۔

انھوں (ابن الصلاح) نے کہا: ایسے لوگوں کو حاکم نے مجروح راویوں میں شمار کیا ہے۔

(دیکھئے المدخل الی کتاب الاکلیل للحاکم ص ۶۵۔۶۶)

فرع (۱): خطیب بغدادی نے کہا: نابینا یا دیکھنے والے ان پڑھ سے سماع دوسرے کے خط یا قول سے ثابت ہو تو اس کی روایت میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ بعض علماء اس کی روایت سے منع کرتے ہیں اور بعض اسے جائز سمجھتے ہیں۔ (دیکھئے الکفایہ ص ۲۲۹)

دوسری فرع (۲): جب کسی شیخ سے صحیح بخاری جیسی کتاب روایت کرے پھر اس کا ایسا

....

(۱) قولِ امام مالک (الکفایہ ص ۲۲۷ وسندہ صحیح)

قولِ امام ابوحنیفہ (الکفایہ ص ۲۳۱، اُس کی سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

قولِ صیدلانی (؟)

نسخہ پائے جس کا مقابلہ اس نے اپنے استاذ کے اصل نسخے سے نہیں کیا، یا اس پر اپنے اصل سماع کا ثبوت نہ پائے لیکن اسے اس کے صحیح ہونے پر دلی سکون ہو تو خطیب نے عام اہلِ حدیث سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس کی روایت سے منع کیا ہے اور یہی قول شیخ ابونصر ابن الصباغ الفقیہ کا ہے۔ ایوب (سختیانی) اور محمد بن بکر البرسانی سے اس کی اجازت مروی ہے۔[1] میں (ابن کثیر) نے کہا: میں اسی کا قائل ہوں۔ واللہ اعلم

شیخ تقی الدین ابن الصلاح نے درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر اس کے شیخ نے اسے اجازت دی ہو تو اس کی روایت جائز ہے اور حال یہی ہے۔

دوسری فرع (۳): اگر حافظ کے حافظے اور اس کی کتاب میں اختلاف ہو جائے، اگر اس کا حفظ کے وقت اعتماد کتاب پر تھا تو کتاب کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اگر کسی اور (مثلاً محدّث سے سُنے الفاظ) پر تھا تو پھر حافظے کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

بہتر یہ ہے کہ وہ کتاب میں اس پر تنبیہ کر دے جیسا کہ شعبہ سے مروی ہے۔

(دیکھئے مسند علی بن الجعد: ۱۶۳، دوسرا نسخہ: ۱۵۹)

اور اسی طرح اگر دوسرے حفاظِ حدیث اس کی مخالفت کریں تو روایت کے وقت یہ بھی بتا دے جیسا کہ سفیان ثوری نے کیا ہے۔ واللہ اعلم (سفیان ثوری والی روایت تو نہیں ملی لیکن سفیان بن عیینہ سے ایسا ثابت ہے۔ دیکھئے مسند الحمیدی: ۵۲، اور الکفایہ ص ۲۲۵)

دوسری فرع (۴): اگر کسی کتاب میں اپنا سماع اپنے خط یا کسی قابلِ اعتماد شخص کے خط سے پالے لیکن اسے اپنا سماع یاد نہ ہو تو ابوحنیفہ[1] اور بعض شوافع سے مروی ہے کہ اس کے لئے اس کی روایت جائز نہیں ہے۔ عام مذہبِ شافعی یہی ہے کہ یہ جائز ہے۔ محمد بن الحسن (بن فرقد الشیبانی) اور (قاضی) ابو یوسف اسی کے قائل ہیں۔[1]

اس میں غالب گمان پر اعتماد ہے جس طرح کہ ہر حدیث کے لئے سماع کا یاد ہونا شرط

(۱) ان اقوال کے ثبوت میں نظر ہے۔ واللہ اعلم

نہیں ہے اسی طرح اصل کتاب کے لئے بھی سماع کا یاد ہونا شرط نہیں ہے۔

[میں (ابن کثیر) نے کہا: یہ اس کے مشابہ ہے کہ راوی جب اپنا سماع بھول جائے تو وہ جس سے سُن لے اس کی روایت جائز ہے۔ اس کا بھولنا مضر نہیں ہے۔ واللہ اعلم]

دوسری فرع (۵): حدیث کی روایت بالمعنٰی

اگر راوی معانیِ حدیث کا عالم اور پہچاننے والا نہ ہو تو بالاتفاق اس حالت میں اس کا روایت بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر وہ اس کا عالم ہو، الفاظ جس پر یہ دلالت کرتے ہیں اور مترادف الفاظ وغیرہ کی بصیرت رکھتا ہو تو جمہور سلف صالحین اور اَخلاف (بعد میں آنے والوں) نے اسے جائز قرار دیا ہے اور اسی پر عمل ہے جیسا کہ صحیح احادیث وغیرہ میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہی واقعہ بہت سے الفاظ اور مختلف جدا طریقوں سے مروی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بعض حدیثیں (متن کے لحاظ سے) بدل جاتی ہیں لہٰذا دوسرے کئی محدثین، فقہاء اور علمِ اصول کے ماہرین نے روایت بالمعنٰی سے منع کیا ہے اور انھوں نے اس میں بہت زیادہ سختی کی ہے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ یہی (مذہب) اختیار کیا جاتا مگر اس پر اتفاق نہ ہو سکا۔ واللہ اعلم

(سیدنا) ابن مسعود، ابو الدرداء اور انس (بن مالک الانصاری) رضی اللہ عنہم جب حدیث بیان کرتے تو فرماتے: "یا اس جیسا" "اس کے مشابہ" یا "اس کے قریب" (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔)

دوسری فرع (٦): کیا حدیث کو مختصر یا بعض حصہ حذف کر کے بشرطیکہ محذوف کا مذکور سے لازمی تعلق نہ ہو، بیان کرنا جائز ہے؟ اس کے بارے میں دو اقوال ہیں:

(امام) ابو عبداللہ البخاری کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ بہت سے مقامات پر حدیث کو مختصر بیان کر دیتے ہیں۔ مگر (امام) مسلم حدیث کو کاٹتے نہیں بلکہ پوری حدیث بیان کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے مغربی (اندلسی) حفاظِ حدیث نے اسے (صحیح مسلم کو) ترجیح دی ہے۔ صحیح بخاری کی بہ نسبت آسانی کی وجہ سے انھوں نے بہ آرام اس کی شروحات لکھی ہیں۔

امام بخاری تو حدیث کو حسبِ ضرورت مختلف مقامات پر پھیلا دیتے ہیں۔

قدیم وجدید زمانے کے جمہور علماء اسی مذہب پر ہیں کہ (حدیث کو مختصر کر کے بیان کرنا) جائز ہے۔ابن الحاجب نے اپنی کتاب ''المختصر'' میں کہا:

''مسئلہ: اکثریت کے نزدیک حدیث کا بعض حصہ حذف کر دینا جائز ہے الا یہ کہ محذوف حصے میں حدیث کی انتہا یا استثناء وغیرہ موجود ہو (تو جائز نہیں ہے)۔ [منتہی الوصول ص ۸۵]

اگر (متن وسند میں) کسی زیادت کے بارے میں شک ہو جائے تو اسے حذف کرنا جائز ہے۔عام طور پر اسی پر عمل ہے۔مالک (رحمہ اللہ) احتیاط کرتے ہوئے ایسا (اختصار) بہت زیادہ کرتے تھے بلکہ جب آپ کو سند کے موصول ہونے میں شک ہوتا تو سند بھی کاٹ دیتے تھے۔

مجاہد (تابعی) نے کہا: حدیث کو کم کر دو مگر اس میں زیادتی نہ کرو۔

(المحدث الفاصل للرامہرمزی ص ۵۴۳ رقم ۷۱۵، الکفایہ ص ۱۸۹، وسندہ صحیح)

دوسری فرع (۷): حدیث کے طالب علم کو عربی زبان کا عالم ہونا چاہئے۔

(عبدالملک بن قُریب) الاصمعی نے کہا: مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر وہ عربی نہیں جانتا تو آپ (ﷺ) کے اس ارشاد میں داخل ہو جائے گا: جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے۔کیونکہ نبی ﷺ زبان بولنے میں لحن (غلطی) نہیں کرتے تھے۔[1]

رہی تصحیف (لکھنے پڑھنے کی غلطی) تو اس کا علاج یہ ہے کہ ماہر اساتذہ سے سُن کر علم حاصل کیا جائے اور اللہ توفیق دینے والا ہے۔

اگر استاذ سے غلطی ہو جائے تو سننے والے کو چاہئے کہ صحیح طریقے سے روایت بیان

(۱) روضۃ العقلاء لابن حبان (ص ۲۲۳) اس کی سند سہل بن ہانی (کے نامعلوم ہونے) کی وجہ سے ضعیف ہے۔قاضی عیاض کی الالماع (ص ۱۳۰) اور خطابی کی غریب الحدیث میں اس کی دوسری سند بھی ہے لیکن اس میں ''بعض اصحابنا'' مجہول ہے۔

کرے۔ یہی بات اوزاعی، ابن المبارک اور جمہور سے مروی ہے۔

(دیکھئے الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع ۲/۲۳)

محمد بن سیرین اور ابو معمر عبداللہ بن سَخْبَرہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جس طرح استاذ سے غلط سُنا ہے اُسی طرح غلط بیان کرے۔ (۱)

ابن الصلاح نے کہا: یہ اتباعِ الفاظ میں غلو والا مذہب ہے۔

قاضی عیاض نے کہا: عام شیوخ کا اسی پر عمل جاری ہے کہ جس طرح اُن تک روایت پہنچی ہے اُسی طرح آگے بیان کردیں۔ وہ اپنی کتابوں میں اسے تبدیل نہیں کرتے حتیٰ کہ قرآن کی قراءتوں میں بھی اُن کا یہی عمل ہے۔

(عام) تلاوت کے خلاف ان کی روایت جاری رہتی ہے۔ بغیر اس کے کہ یہ شاذ قرار دیا جائے جیسا کہ صحیحین اور موطأ میں پایا جاتا ہے لیکن حدیث کی معرفت رکھنے والے سماع کے وقت اور حواشی میں اس کے بارے میں تنبیہ کردیتے ہیں۔ (دیکھئے الالماع ص ۱۳۱، ۱۳۲)

بعض لوگ کتابوں میں تبدیلی اور اصلاح کی جرأت شروع کردیتے ہیں جیسا کہ ابو الولید ہشام بن احمد الکنانی الوقشی (الاندلسی) نے کثرتِ مطالعہ اور فنون پر مہارت کی وجہ سے یہ کام کیا۔

(ابن الصلاح نے) کہا: انھیں (الوقشی کو) کئی چیزوں میں غلطی لگی اور اسی طرح ان کا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کو غلطیاں لگتی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تبدیلی اور اصلاح کا دروازہ ہی بند کردیا جائے تاکہ جو ماہر نہیں ہے وہ اس کی جرأت نہ کرے اور سماع کے وقت اس پر تنبیہ کردینی چاہئے۔

(۱) اس کے ثبوت میں نظر ہے۔ نیز دیکھئے المحدث الفاصل (ص ۵۳۵) جامع بیان العلم لابن عبدالبر (۱/۸۰) اور کتاب العلم لابن ابی خیثمہ (رقم ۱۳۴) تاہم یہ ثابت ہے کہ امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ روایت باللفظ کے قائل تھے اور اس میں تشدد کرتے تھے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ ان کے والد (امام احمد بن حنبل) فاحش غلطی[1] کی اصلاح کر دیتے تھے اور ہلکی پھلکی غلطی سے درگزر فرماتے تھے۔

(الکفایہ ص ۱۸۷، وسندہ ضعیف لانقطاعہ)

میں (ابن کثیر) نے کہا: بعض لوگ جب اپنے استاد سے لحن والی روایت سنتے ہیں تو اس سے روایت ہی ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ اس کی اتباع کریں تو (سب جانتے ہیں کہ) نبی ﷺ اپنے کلام میں لحن نہیں کرتے تھے اور اگر صحیح طریقے سے بیان کریں تو (یہ جھوٹ ہے کیونکہ) انھوں نے ایسا نہیں سُنا تھا۔

فرع (۸): جو معلوم (ومشہور) چیز سند یا متن سے گر جائے تو اس کے لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر کتاب کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے تو صحیح طریقے سے اس کی تجدید کرنا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور اللہ جانتا ہے کہ کون فسادی ہے اور کون اصلاح کرنے والا ہے۔ [البقرہ:۲۲۰]

دوسری فرع (۹): جب راوی دو استادوں یا زیادہ سے روایت بیان کرے اور ان کے الفاظ میں اختلاف ہو تو اگر وہ سب کا متن اکٹھا کر دے تو ایسا کرنا جائز ہے جیسا کہ زہری نے اِفک والی حدیث میں کیا ہے۔ اسے انھوں نے سعید بن المسیب اور عروہ (بن الزبیر) وغیرہما سے انھوں نے (سیدہ) عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے بیان کرتے ہوئے کہا: ''ان سب نے مجھے حدیث کا کچھ کچھ حصہ سُنایا ہے۔ ان کی روایات ایک دوسرے میں داخل ہو (کر ایک متن بن) گئی ہیں۔'' پھر انھوں نے سارا متن اکٹھا بیان کر دیا۔ یہ عمل جائز ہے کیونکہ اسے (تمام) اماموں کی تلقی بالقبول حاصل ہے۔ انھوں نے اسے اپنی کُتبِ صحاح

(۱) فاحش غلطی کی اصلاح کی مثال یہ ہے کہ ''قال عائشة رضي الله عنه'' اس کی فوراً اصلاح کر کے ''قالت عائشة رضي الله عنها'' لکھ دینا چاہیے۔

وغیرہ میں روایت کیا ہے۔[1]

راوی کو چاہئے کہ ہر ایک کی روایت کو علیحدہ علیحدہ، کمی بیشی اور حدثنا أخبرنا وأنبأ نا وغیرہ کے ساتھ بیان کرے۔

(امام) مسلم اپنی کتاب صحیح مسلم میں مبالغہ کرتے ہوئے اس کا خاص خیال رکھتے ہیں جبکہ (امام) بخاری عام طور پر اس کا خاص خیال نہیں رکھتے اور نہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ بعض مقامات پر اس کا خیال رکھتے ہیں اور یہ نادر ہے۔ (مثلاً دیکھئے صحیح بخاری: ۵۵۸۷)

فرع (۱۰): اپنی طرف سے صراحت کر کے راوی کے نسب میں اضافہ کرنا جائز ہے اور یہی بات (امام) احمد بن حنبل اور جمہور محدثین سے مروی ہے۔ واللہ اعلم

(دیکھئے الکفایہ ص ۲۱۵، وسندہ ضعیف عن احمد لانقطاعہ)

فرع (۱۱): محدثین کی یہ عادت جاری رہی ہے کہ جب وہ قراءت کرتے تو یہ کہتے تھے:

''مجھے فلاں نے خبر دی، کہا: ہمیں فلاں نے خبر دی، کہا: ہمیں فلاں نے خبر دی''

ان میں سے بعض ''قال'' (کہا) کا کلمہ (لکھتے وقت) حذف کر دیتے تھے اور اکثریت کے نزدیک یہ بہتر ہے۔ جو حدیثیں ایک سند سے ہوں مثلاً ''**عبدالرزاق عن معمر عن همام عن أبي هريرة**'' کی سند والا نسخہ ''**محمد بن عمرو عن أبي سلمة عن أبي هريرة**'' والا نسخہ ''**عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده**'' والا نسخہ ''**بهز بن حكيم عن أبيه عن جده**'' وغیرہ والے نسخے تو راوی کے لئے جائز ہے کہ ہر حدیث کے وقت سند دوبارہ بیان کردے اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلی حدیث کے ساتھ سند بیان کر کے باقی حدیثوں میں ''اسی سند کے ساتھ'' اور ''اسی کے ساتھ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ

---

(۱) معلوم ہوا کہ امام زہری کی بیان کردہ حدیث اِفک بالاجماع صحیح ہے اور اسے ساری امت نے تلقی بالقبول کا درجہ دیا ہے لہٰذا عصرِ حاضر کے بعض نواصب اور منکرینِ حدیث کا اس پر جرح کرنا مردود ہے۔

حدیث الافک کے لئے دیکھئے صحیح بخاری (۲۶۶۱) اور صحیح مسلم (۲۷۷۰)

فرمایا ہے'' کہہ دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس نے جیسے سُنا ہے اُسی طرح بیان کرے اور ہر حدیث کے ساتھ سند بیان کرنا بھی جائز ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: یہ معاملہ بہت آسان (اور ہر لحاظ سے جائز) ہے۔ واللہ اعلم

اگر متن کو سند سے پہلے بیان کر دے جیسے کہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے'' پھر ''أخبرنا'' کہہ کر اس کی سند بیان کرے تو کیا راوی کے لئے جائز ہے کہ پہلے سند بیان کرے اور پھر متن بیان کرے؟ اس میں اختلاف ہے جسے خطیب اور ابن الصلاح نے ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے الکفایہ ص۲۱۱، ۲۱۲ و مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۰۶)

میرے نزدیک اس کا جائز ہونا ہی زیادہ بہتر ہے۔ واللہ اعلم

اسی لئے ہمارے زمانے کے محدثین حدیث کی روایت کے بعد شیخ کی سند دہرا دیتے ہیں کیونکہ بعض لوگوں سے کوئی چیز رہ جاتی ہے تو اس طریقے سے اس کا شیخ سے سماع متصل ہو جاتا ہے۔

اس کے لئے جائز ہے کہ جیسے چاہے روایت کرے، سند پہلے بیان کر دے یا بعد میں۔ واللہ اعلم

فرع (۱۲): جب اپنی سند سے ایک حدیث بیان کرے پھر اس کے بعد دوسری سند ذکر کر کے آخر میں ''مثلہ'' یا ''نحوہ'' کہہ دے اور یہ شخص ثقہ حافظ ہو تو کیا دوسری سند کے ساتھ پہلی حدیث کے الفاظ بیان کرنے صحیح ہیں؟

شعبہ کہتے ہیں: نہیں، اور ثوری کہتے ہیں: جی ہاں، ان سے وکیع نے نقل کیا ہے۔

(دیکھئے الکفایہ ص۲۱۳ و سندہ صحیح)

یحیٰی بن معین نے کہا: ''مثلہ'' والے قول میں یہ جائز ہے اور ''نحوہ'' میں جائز نہیں ہے۔

(الکفایہ ص۲۱۳، اس کی سند محمد بن حمید بن سہل المخرمی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

خطیب نے کہا: اگر روایت بالمعنیٰ کو جائز کہا جائے تو مثلہ اور نحوہ میں کوئی فرق نہیں ہے، اور اس کے باوجود میں ابن معین کے قول کو اختیار کرتا ہوں۔ واللہ اعلم (الکفایہ ص۲۱۴)

اگر ایک سند بیان کر کے کچھ حدیث ذکر کرے، پھر کہے: ''الحدیث'' ''الحدیث بتمامه'' یا ''بطوله'' یا ''إلی آخره'' (إلخ) جیسا کہ عام راویوں کی عادت ہے تو کیا سننے والا اس سند کے ساتھ ساری حدیث بیان کر سکتا ہے؟

بعض نے اس کی اجازت دی اور بعض نے اس سے منع کیا جن میں استاذ ابو اسحاق الاسفرائنی الفقیہ الاصولی بھی ہیں۔

ابوبکر البرقانی نے اپنے شیخ ابوبکر الاسماعیلی سے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: اگر شیخ اور پڑھنے والا دونوں حدیث جانتے ہیں تو مجھے امید ہے کہ یہ جائز ہے اور بہتر یہی ہے کہ یہ فرق واضح بیان کیا جائے۔ (الکفایہ ص ۳۱۱)

ابن الصلاح نے کہا: جب ہم اسے جائز قرار دیں تو متحقق یہی ہے کہ اس کے ساتھ مضبوط وموکد اِجازت ہو۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اس میں تفصیل بیان کرنی چاہئے۔ اگر اس نے حدیثِ مذکور کو اسی استاذ سے اسی مجلس یا کسی دوسرے وقت سُنا ہے تو روایت جائز ہے۔ جس کا بیان گزر چکا اور سماع ثابت ہو چکا ہے یہ اس کے لئے اشارہ ہو جائے گا (ورنہ نہیں۔) واللہ اعلم

فرع (۱۴): رسول کا لفظ نبی سے اور نبی کا لفظ رسول سے بدلنا۔

ابن الصلاح نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے اور اگرچہ روایت بالمعنیٰ جائز ہے یعنی ان کے معنوں کے درمیان اختلاف ہے۔

عبداللہ بن احمد سے منقول ہے کہ ان کے والد (امام احمد بن حنبل) اس بارے میں سختی کرتے تھے۔ اگر کتاب میں نبی کا لفظ ہوتا اور محدّث رسول لکھ دیتا تو آپ رسول کو کاٹ کر نبی لکھتے تھے۔ (الکفایہ ص ۲۴۴ وسندہ صحیح)

خطیب نے کہا: آپ کا یہ فعل استحباب پر محمول ہے کیونکہ آپ کا مسلک یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ (الکفایہ ص ۲۴۴)

صالح (بن احمد بن حنبل) نے کہا: میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں پوچھا تو

انھوں نے کہا: میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(الکفایہ ص ۲۴۴ وسندہ صحیح، ابو طالب علی بن محمد بن احمد بن الجہم الکاتب ثقہ)

مروی ہے کہ حماد بن سلمہ کے سامنے عفان (بن مسلم) اور بہز (بن اسد) یہ کام کرتے تھے تو انھوں نے کہا: تم دونوں کبھی فقیہ نہیں بنو گے۔ (الکفایہ ص ۲۴۴، ۲۴۵ وسندہ ضعیف، فیہ شیخ مجہول)

فرع (۱۴): حالتِ مذاکرہ والی روایت، کیا اس کی روایت جائز ہے؟

ابن الصلاح نے ابن مہدی، ابن المبارک اور ابوزرعہ (رازی) سے نقل کیا ہے کہ اسے بطورِ حدیث بیان کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس میں تساہل پایا جاتا ہے اور حافظہ دھوکا دے جاتا ہے۔ [1]

ابن الصلاح نے کہا: اسی لئے بڑے حفاظِ حدیث نے یاد کردہ روایت کو کتاب کے بغیر بیان کرنے سے منع کیا ہے جن میں احمد بن حنبل بھی شامل ہیں۔ (الجامع لاخلاق الراوی: ۱۰۳۱، وھو حسن)

(ابن الصلاح نے) کہا: جب اسے بطورِ حدیث بیان کرے تو یہ کہے: "فلاں نے ہمیں یہی حدیث مذاکرے کے طور پر یا مذاکرے میں سنائی" اسے مطلقاً (اس صراحت کے بغیر) بیان نہ کرے ورنہ وہ ایک قسم کی تدلیس کا مرتکب ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

اگر حدیث دو راویوں سے مروی ہو تو یہ جائز ہے کہ ان میں سے ثقہ کا ذکر کر کے دوسرے کو گرا دے، چاہے وہ گرایا جانے والا ثقہ ہو یا ضعیف۔

(امام) ابن لہیعہ کے بارے میں مسلم ایسا عام طور پر کرتے تھے۔ رہے (امام) احمد بن حنبل تو وہ اسے گرانے کے بجائے ذکر کرتے تھے۔ واللہ اعلم

---

(۱) ☆ قول عبدالرحمٰن بن مہدی (الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع: ۱۱۱۰، اس کی سند ابراہیم بن محمد الکندی کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ح ۱۱۱۱، اس کی سند شعیب بن علی القاضی کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

☆ قول عبداللہ بن المبارک (الجامع لاخلاق الراوی: ۱۱۱۲، اس کی سند محمد بن الحسن الہاشمی، احمد بن حسن بن عثمان القاضی اور احمد بن محمد بن سلیمان التستری کی وجہ سے ضعیف ہے۔)

☆ قول ابی زرعۃ الرازی (الجامع لاخلاق الراوی: ۱۱۱۳، وسندہ صحیح)

(۲۷) ستائیسویں قسم: آدابِ محدّث

خطیب بغدادی نے اس کے بارے میں کتاب ''الجامع لآداب الراوی والسامع'' لکھی ہے۔

سابقہ انواع (اقسام) کی اطراف میں اس کی اہم باتیں گزر چکی ہیں۔

ابن خلاد (الرامَہُرمُزی) وغیرہ نے کہا: شیخ کو چاہئے کہ (اپنی عمر کے) پچاس سال پورے ہونے کے بعد ہی حدیثیں بیان کرنا شروع کرے۔ (المحدث الفاصل ص ۳۵۲)

کسی اور نے کہا: چالیس سال کے بعد حدیثیں بیان کرنا شروع کردے۔

قاضی عیاض نے اس سے انکار کیا کہ بہت سے لوگوں نے چالیس بلکہ تیس سال پورے ہونے سے پہلے حدیثیں بیان کی ہیں، اُن میں مالک بن انس ہیں۔ لوگ ان کے پاس حدیثیں سننے کے لئے اکٹھے ہوگئے تھے حالانکہ اُن کے بہت سے استاد (اس وقت) زندہ تھے۔

ابن خلاد (الرامَہُرمُزی) نے کہا: جب وہ اسی سال (۸۰) کی عمر تک پہنچ جائے تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے کہ وہ اختلاط کے خوف کی وجہ سے حدیثیں بیان کرنے سے رُک جائے۔ (المحدث الفاصل ص ۳۵۴)

لوگوں نے (قاضی ابن خلاد پر) یہ استدراک (اور اعتراض) کیا ہے کہ صحابہ کرام وغیرہم کی ایک جماعت نے اس عمر کے بعد حدیثیں بیان کی ہیں جن میں انس بن مالک، سہل بن سعد، عبداللہ بن ابی اوفی اور بہت سے لوگ تھے۔

بعض لوگوں نے سو سال (۱۰۰) پورے ہونے کے بعد بھی حدیثیں بیان کی ہیں جن میں حسن بن عرفہ، ابوالقاسم البغوی، ابو اسحاق الہجیمی اور ائمہ شافعیہ میں سے قاضی ابوالطیب الطبری تھے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اور بھی بہت سے لوگ تھے لیکن اگر روایت بیان کرنے والے شیخ کے حافظے پر اعتماد ہو تو بڑی عمر کے بعد اختلاط کے ڈر سے حدیثیں بیان کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے اور اگر کسی دوسرے کے حافظے، خط یا ضبط (مثلاً کسی مشہور کتاب کی

روایت) پر اعتماد ہو تو اس حالت میں جتنی عمر زیادہ ہو گی لوگ اس سے سماع میں دلچسپی لیں گے جس طرح کہ ہمارے شیخ ابو العباس احمد بن ابی طالب الحجاز کا معاملہ ہوا، وہ یقیناً سو سال (۱۰۰) سے تجاوز کر گئے تھے۔ انھوں نے (حسین بن المبارک) الزُّبیدی (البغدادی) سے چھ سو تیس (۶۳۰) میں صحیح بخاری سُنی اور اُسے سات سو تیس (۷۳۰) میں سُنایا۔ وہ بڑی عمر کے عامی شخص تھے، کسی چیز کا ضبط نہیں رکھتے تھے اور نہ بہت سے ظاہر معانی کا انھیں پتا تھا، اس کے باوجود ان کے پاس (صحیح بخاری) سننے کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا کیونکہ زبیدی سے (اُس وقت) اُن کے علاوہ دوسرا کوئی راوی نہیں تھا۔ ان سے ایک لاکھ یا زیادہ لوگوں نے صحیح بخاری سُنی ہے۔

(علماء کرام نے) کہا: مُحدّث کو خوبصورت اخلاق، اچھے چال چلن اور صحیح نیت کا حامل ہونا چاہئے۔ اگر اس کی نیت میں خیر کی طرف مسابقت نہ ہو تو بھی لوگوں کو سُنانا شروع کرے کیونکہ علم اُسے اس طرف لے آئے گا۔ بعض اسلاف نے کہا: ہم نے غیر اللہ کے لئے علم حاصل کیا مگر علم نے انکار کر دیا کہ وہ صرف اللہ کے لئے ہے۔[1]

انھوں نے کہا: عمر اور سماع میں برتری والے کی موجودگی میں حدیث بیان نہیں کرنی چاہئے بلکہ بعض لوگ اسی شہر میں حدیث بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے جس میں (ان کے خیال میں) اُن سے زیادہ مستحق محدّث موجود ہوتا تھا۔

(دیکھئے الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع ۱/۳۲۰ ح ۷۰۵ وسندہ صحیح، ۱/۳۱۹ ح ۷۰۱ وسندہ حسن)

اسے چاہئے کہ اس زیادہ افضل محدّث کی طرف راہنمائی کرے کیونکہ دین خیر خواہی کا نام ہے۔

انھوں نے کہا: اسے مجلسِ تحدیث منعقد کرنی چاہئے۔ حدیثیں بیان کرنے والا بہترین حالت میں تشریف لائے جیسے کہ (امام) مالک رحمہ اللہ جس مجلسِ تحدیث میں

(۱) دیکھئے حلیۃ الاولیاء ۵/۶۱، ابونعیم نے ایسا قول حبیب بن ابی ثابت سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

تشریف لاتے تو وضو کرتے اور کبھی کبھار غسل کرتے، خوشبو لگاتے اور بہترین لباس پہنتے۔ آپ پر وقار اور ہیبت طاری ہوتی۔ آپ اپنی مضبوطی سے بیٹھ جاتے اور جو شخص آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا تو اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ (۱)

اس مجلس کا افتتاح بطورِ تبرک کچھ تلاوتِ قرآن سے کرنا چاہیے پھر اس کے بعد اچھے طریقے سے (اللہ کی) حمد وثنا اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا چاہیے۔

قاری اچھی آواز، بہترین ادا اور فصیح عبارت والا ہونا چاہیے۔ جب بھی نبی ﷺ کا ذکر آئے تو آپ پر درود وسلام پڑھے۔

خطیب نے کہا: اس کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے اور جب کسی صحابی کا نام آئے تو رضی اللہ عنہ کہے۔

بہتر یہ ہے کہ اپنے استاد کی تعریف کرے جیسا کہ عطاء (بن ابی رباح) فرماتے: مجھے عالم اور (علم کے) دریا ابن عباس نے حدیث بیان کی۔

وکیع (بن الجراح) فرماتے تھے کہ مجھے امیر المومنین فی الحدیث سفیان ثوری نے حدیث بیان کی۔ (۲) کسی کو بھی ناپسندیدہ لقب کے ساتھ بیان نہیں کرنا چاہیے رہا وہ لقب جو (شہرت کی وجہ سے) امتیازی نشان بن گیا ہے، اس کے ساتھ کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲۸) اٹھائیسویں قسم: طالبِ حدیث کے آداب

جس قدر ہو سکے نیت خالص اللہ تعالیٰ (کی رضامندی) کے لئے ہونی چاہیے بلکہ ایسا کرنا واجب ہے۔ دنیا کو مقصد نہیں قرار دینا چاہیے۔ ہم نے (اپنی کتاب) ''المقدمات''

---

(۱) امام مالک رحمہ اللہ جب حدیث بیان کرنے کے لئے باہر آنے کا ارادہ کرتے تو نماز والا وضو فرماتے، بہترین لباس پہنتے، اپنی ٹوپی سر پر رکھتے اور داڑھی کی کنگھی کرتے تھے۔ اس عمل کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اس طرح میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا احترام کرتا ہوں۔

دیکھئے الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع (۱/۳۸۸ ح ۹۰۳ وسندہ صحیح)

(۲) الجامع لاخلاق الراوی (۲/۸۶ ح ۱۲۵۰، وسندہ ضعیف)

میں اس سلسلے میں سخت وعیدیں اور ڈرانے والی دلیلیں ذکر کی ہیں۔

اپنے علاقے میں عالی اسانید کے سننے میں جلدی کرنی چاہیے۔ جب یہ اکٹھی کر لی جائیں تو قریبی علاقوں یا (علمی طور پر) اعلیٰ شہروں کی طرف سفر کرنا چاہیے، اسے رحلہ کہتے ہیں۔

ہم نے ''المقدمات'' میں اس کی مشروعیت (مسنونیت) ذکر کی ہے۔

ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ نے کہا: اللہ اس امت سے اصحابِ حدیث کے رحلہ (علمی سفر) کی وجہ سے مصیبتیں ٹال دیتا ہے۔[1]

انھوں نے کہا: احادیث میں جن فضائل کا ذکر آیا ہے، حتی الوسع انھیں استعمال کرنا چاہیے۔

بشر بن الحارث الحافی فرماتے تھے: یا اصحاب الحدیث! حدیث کی زکوٰۃ ادا کرو، ہر دو سو حدیثوں میں سے پانچ حدیثیں (ان پر عمل کرو۔)[2]

عمرو بن قیس الملائی نے کہا: اگر تمھیں نیکی کی کوئی چیز معلوم ہو تو اسی پر عمل کرو اگرچہ ایک دفعہ ہو، تو نیکی کرنے والوں میں سے ہو جائے گا۔[3]

وکیع نے کہا: اگر تم حدیث یاد کرنا چاہتے ہو تو اس پر عمل کرو۔[4]

انھوں (علماء نے) کہا: سماعِ حدیث میں بہت زیادہ وقت لگا کر شیخ کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔

....

(۱) اسے خطیب نے الرحلہ (۱۵) اور شرف اصحاب الحدیث (ص ۵۹) میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند موضوع ہے۔ اس کا راوی محمد بن الحسن بن زیاد النقاش کذاب ہے لہٰذا اس قول کو کبھی ابراہیم بن ادہم کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔ اصولِ حدیث کے ان ماہر علمائے کرام پر تعجب ہے جو اس قسم کی موضوع و مردود روایتیں بغیر جھجک کے اصولِ حدیث اور کتبِ اسماء الرجال میں لے آئے ہیں۔

(۲) الجامع للخطیب: ۱۸۱، وسندہ حسن، ادب الاملاء والاستملاء للسمعانی ص ۱۱۰

(۳) حلیۃ الاولیاء ۱۰۲/۵، وسندہ ضعیف، ابو خالد الاحمر مدلس تھے اور باقی سند صحیح ہے۔

(۴) یہ حوالہ نہیں ملا ہے۔ ابراہیم بن اسماعیل بن مجمع (ضعیف راوی) نے کہا: ''کنا نستعین بالحدیث علی حفظہ بالعمل'' ہم حدیث یاد کرنے کے لئے عمل سے مدد لیتے تھے۔ (الجامع للخطیب ۲/۲۵۹ ح ۱۷۸۹، وسندہ صحیح)

زہری نے کہا: جب مجلس لمبی ہو جائے تو اس میں شیطان کا حصہ ہوتا ہے۔[1]

دوسرے طالب علموں کو علمی فائدے بتانے چاہئیں۔ علم کی کوئی چیز نہیں چھپانی چاہئے کیونکہ (احادیث میں) اس کی ممانعت آئی ہے۔

انھوں نے کہا: روایت لکھنے اور روایت حاصل کرنے میں کم درجے کے آدمی سے بھی ہچکچانا نہیں چاہئے۔ وکیع نے کہا: آدمی اس وقت تک بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا جب تک بڑے، برابر اور چھوٹے لوگوں سے حدیث نہ لکھے۔[2]

ابن الصلاح نے کہا: وہ آدمی توفیق یافتہ نہیں ہے جس نے مجرد کثرتِ روایات اور شہرت کے لئے بہت ہی زیادہ استادوں سے روایات لکھنے میں وقت ضائع کر دیا۔

انھوں نے کہا: ابو حاتم الرازی کا قول: جب لکھے تو ہر ایک سے لکھ اور جب حدیث بیان کرے تو تفتیش کر۔[3] اس باب سے نہیں ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: پھر طالبِ حدیث کو بغیر فہم و معرفت کے مجرد سماع اور لکھنے پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس طرح وہ اپنے آپ کو تھکانے والا تو بنے گا مگر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

پھر انھوں نے مسانید اور سنن میں سے مفید کتابوں کے سماع پر زور دیا۔[4]

(۱) الجامع للخطیب (۱۳۸۵) وسندہ حسن

(۲) الجامع للخطیب (۱۶۵۵) اس کی سند ابراہیم بن محمد بن نقیرہ (ضعیف/ تاریخ بغداد ۱۵۹/۶) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۳) الجامع للخطیب (۱۶۷۰) وسندہ حسن

(۴) مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، منتقی ابن الجارود، سنن ابی داود، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، مستدرکِ حاکم، المختارہ، السنن الکبریٰ للبیہقی وغیرہ کتابوں کی قراءت اور سماع میں مشغول رہنا چاہئے۔

(۲۹) انتیسویں قسم: عالی اور نازل سندوں کی معرفت

کیونکہ اس اُمت کی خصوصیتوں میں سے سند (کا علم) ہے۔ اس لئے کہ اس اُمت کے علاوہ کوئی اُمت بھی سند کے ساتھ اپنے نبی کی حدیثیں بیان نہیں کر سکتی لہٰذا عالی سندیں حاصل کرنا مرغوب عمل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا: عالی سند سلف صالحین کی سنت ہے۔ (۱)

یحییٰ بن معین سے ان کی وفات کے وقت پوچھا گیا: آپ کی کیا خواہش ہے؟ انھوں نے فرمایا: خالی گھر اور عالی سند۔ (۲)

اس لئے بہت سے محقق اماموں اور ماہر حفاظِ حدیث نے عالی سندیں تلاش کرنے کے لئے مختلف علاقوں کی طرف خوشی سے سفر کئے۔ اگرچہ بعض جاہل عبادت گزاروں نے رحلت (ان سفروں) سے منع کیا ہے جیسا کہ رامُہر مُزی نے اپنی کتاب (المحدث) الفاصل (ص ۲۱۷) میں نقل کیا ہے۔ پھر یہ کہ نازل کی بہ نسبت عالی سند خطا اور علت سے زیادہ دور ہوتی ہے۔

بعض متکلمین نے کہا: جتنی سند لمبی ہوگی، راویوں کے حالات اور جرح وتعدیل زیادہ ہوگی تو اس مشقت کی وجہ سے اس کا اجر بھی زیادہ ہوگا۔ (۳)

لیکن یہ فائدہ سابقہ فوائد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ واللہ علم

اقسامِ علو میں سب سے بہترین وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زیادہ قریب ہو۔

کسی حافظ امام، مصنف یا تقدمِ سماع کا عالی ہونا نسبتی امور میں سے ہے۔

---

(۱) الجامع للخطیب (۱/۱۲۳ ح ۱۱۶) اس کی سند عبدالمؤمن بن احمد بن حوثرہ (مجہول الحال) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۲) بے اصل ہے۔ اس کی کوئی متصل سند کسی کتاب میں بھی نہیں ملی۔

(۳) دیکھئے المحدث الفاصل (ص ۲۱۶ رقم: ۱۰۶) اور الجامع للخطیب (۱/۱۱۶ قبل ح ۹۸)

[موافقت:] شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے یہاں موافقت پر بھی کلام کیا ہے۔ مثلاً: (صحیح مسلم روایت کرنے والے کی سند) مسلم (بن الحجاج) کے شیخ تک پہنچ جائے۔

[بدل:] اپنے شیخ کے شیخ یا اس جیسے شیخ تک سند کا پہنچنا بدل کہلاتا ہے۔

[مساوات:] اگر آپ کی سندِ حدیث مصنف کے برابر ہو جائے تو اسے مساوات کہتے ہیں۔

[مصافحہ:] اگر آپ ایک درجہ مصنف سے نیچے اُتر آئیں تو اسے مصافحہ کہتے ہیں گویا کہ آپ نے ان سے مصافحہ کیا اور اُن سے حدیث سُنی۔

خطیب بغدادی وغیرہ کے کلام میں اس قسم کے فنون (علمی نکتے) بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

حافظ ابن عساکر نے اس کے بارے میں کئی جلدیں لکھی ہیں۔ میرے نزدیک بقیہ فنون کے مقابلے میں یہ کم فائدے والی قسم ہے۔

جس نے یہ کہا کہ عالی سند وہ ہے جو صحیح ہو اگرچہ اس کے راوی زیادہ ہوں تو یہ خاص اصطلاح ہے۔ یہ آدمی اس وقت کیا کہے گا جب دو صحیح سندیں ہوں لیکن ایک سند کے راوی کم ہوں؟ یہ قول وزیر نظام الملک اور حافظ سِلَفی سے مروی ہے۔ علو (عالی) کی ضد نزول (نازل) ہے۔ یہ عالی کے مقابلے میں کم فضیلت والا ہے اِلا یہ کہ نازل سند کے راوی عالی سند سے بہتر ہوں، اگر سب ثقہ ہوں۔ جیسا کہ وکیع نے اپنے ساتھیوں (شاگردوں) سے کہا: تمھارے نزدیک "**الأعمش عن أبي وائل عن ابن مسعود**" والی سند پسندیدہ ہے یا "**سفیان (الثوري) عن منصور عن إبراهیم عن علقمة عن ابن مسعود**" والی؟ انھوں نے کہا: پہلی سند، وکیع نے کہا: الاعمش عن ابی وائل تو شیخ عن شیخ ہے جبکہ سفیان عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعود: فقیہ عن فقیہ ہے۔ جس حدیث کو فقہاء ایک دوسرے سے بیان کریں، وہ میرے نزدیک شیوخ کی بیان کردہ روایت سے بہتر ہے۔

(المدخل للبیہقی: ۱۴۰، ۱۵، وسندہ صحیح وفی ہذا الکلام نظر ولعل وکیعا رجع عن قولہ، انظر الکفایہ للخطیب ص ۳۹۹ وسندہ صحیح)

(۳۰) تیسویں قسم: مشہور

شہرت (مشہور ہونا) نسبتی معاملہ ہے۔ایک چیز اہلِ حدیث (محدثین) کے نزدیک مشہور یا متواتر ہوتی ہے جبکہ دوسروں کے نزدیک نہیں ہوتی۔

پھر مشہور متواتر بھی ہوتی ہے اور مستفیض بھی۔ مستفیض اسے کہتے ہیں جسے تین سے زیادہ (اور متواتر سے کم) راوی بیان کریں۔

قاضی ماوردی نے کہا: مستفیض متواتر سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔! (دیکھئے ادب القاضی ۱/۳۷۱)

یہ ان کی خاص اصطلاح ہے۔

مشہور حدیث صحیح بھی ہوتی ہے جیسے ((الأعمال بالنیات)) والی حدیث اور حسن بھی ہوتی ہے۔لوگوں کے درمیان ایسی حدیثیں بھی مشہور ہو جاتی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی یا کلیتاً وہ موضوع ہوتی ہیں اور یہ بہت زیادہ ہیں۔[۱]

جس نے ابو الفرج ابن الجوزی کی کتاب الموضوعات دیکھی ہے وہ اسے (خوب) جانتا ہے۔امام احمد سے مروی ہے[۲] کہ چار حدیثیں لوگوں کے درمیان بازاروں میں زبان زدِ عام (مشہور) ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے:

۱: "من بشرني بخروج آذار بشرته بالجنة" جس نے آذار (ایک مہینے) کے ختم ہونے کی مجھے خبر دی میں اسے جنت کی خوشخبری دوں گا۔[۳]

---

(۱) مثلاً: اختلاف أمتي رحمة، بے اصل روایت ہے۔

دیکھئے تحریر علوم الحدیث لعبداللہ بن یوسف الجدیع العراقی (۱/۴۶)

(۲) امام احمد کی طرف منسوب یہ قول با سند صحیح ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے التذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ للزرکشی (ص۳۲) التقیید والایضاح (ص۲۶۳) اور الموضوعات لابن الجوزی (۲/۲۳۶، وفیہ احمد بن محمد الصید لانی: لم نعرفہ)

(۳) یہ بالکل بے سند اور من گھڑت روایت ہے۔حافظ عراقی نے التقیید والایضاح (ص۲۶۴) میں کہا: "لا أصل له" ابن الملقن نے اصولِ حدیث کی کتاب "المقنع" میں کہا: "لایعرف له سند" (۲/۴۲۹)

۲: "من آذى ذميًا فأنا خصمه يوم القيامة" جس نے کسی ذمی کو تکلیف دی تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا۔ (۱)

(۳) "نحركم يوم صومكم" جس دن تمھارا روزہ ہے اس دن تمھاری قربانی (عیدالاضحیٰ) ہے۔ (۲)

(۴) "للسائل حق وإن جاء علىٰ فرس" سائل کا حق ہے (کہ اسے صدقہ دیا جائے) اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ (۳)

(۳۱) اکتیسویں قسم: غریب اور عزیز کی معرفت

غرابت یعنی غریب ہونا کبھی (سارے) متن میں ہوتا ہے۔ جس کی روایت کے ساتھ ایک راوی منفرد ہوتا ہے اور کبھی بعض (متن) میں جیسا کہ ایک راوی ایسی زیادت (اضافہ) بیان کر دیتا ہے جو کوئی دوسرا نہیں بیان کرتا۔ اس پر کلام ثقہ کی زیادت میں گزر چکا ہے۔

غرابت کبھی سند میں ہوتی ہے جیسے کہ اصل حدیث (کا متن) تو دوسری سند یا سندوں سے محفوظ ہوتا ہے لیکن یہ روایت اس سند کے ساتھ غریب (اُوپری) ہوتی ہے۔

غریب اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ ایک راوی منفرد ہو، چاہے ثقہ ہو یا ضعیف، ہر ایک کا اپنا اپنا حکم ہوتا ہے۔ (۴)

---

(۱) تاریخ بغداد (۳۷۰/۸) الموضوعات لابن الجوزی (۲۳۶/۲) اس کی سند عباس بن احمد المذکر کی وجہ سے منکر اور موضوع ہے۔

(۲) یہ بے اصل و بے سند روایت ہے۔ دیکھئے المقنع فی علوم الحدیث (۴۲۹/۲)

(۳) سنن ابی داود (۱۶۶۵) وھو حدیث حسن۔ یحییٰ بن ابی یعلیٰ حسن الحدیث وثقہ ابن خزیمہ وابن حبان .

(۴) ثقہ راوی کی محفوظ وغیر معلول روایت صحیح ہوتی ہے اور ضعیف راوی کی روایت ضعیف ہوتی ہے۔

فائدہ: غریب روایت کبھی صحیح ہوتی ہے، جیسے إنما الأعمال بالنیات، اور کبھی ضعیف و مردود ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ سند و متن، راویوں کی تحقیق اور اصولِ حدیث سے کیا جاتا ہے۔

اگر ایک شیخ سے دو یا تین راوی روایت کریں تو اسے عزیز کہتے ہیں اور اگر اسے ایک جماعت (مثلاً چار سے نو تک) بیان کریں تو یہ مشہور کہلاتی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
واللہ اعلم

(۳۲) بتیسویں قسم: غریب الحدیث (حدیث کے مشکل الفاظ کی تشریح)

حدیث کے فہم، علم اور عمل سے متعلق یہ اہم قسموں میں سے ہے۔ اس کا علمِ سند اور اس کے متعلقات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حاکم نے کہا: اس کے بارے میں سب سے پہلے نضر بن شمیل نے کتاب لکھی ہے۔[1]

دوسرے نے کہا: ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ نے سب سے پہلے اس میں کتاب لکھی ہے۔

اس علم میں سب سے بہترین کتاب ابو عبید قاسم بن سلام کی (غریب الحدیث) ہے۔

ان پر ابن قتیبہ (الدینوری) نے کئی استدراکات کئے ہیں۔

ان دونوں پر خطابی نے تعقبات کئے اور اضافے لکھے ہیں۔

ابن الانباری متقدم (لعلہ محمد بن القاسم بن بشار النحوی/توفی ۳۲۸ھ) اور سلیم الرازی وغیرہما نے اس کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔

ان تمام کتابوں کے مجموعے والی دو کتابیں (۱) الصحاح للجوہری (۲) النہایہ لابن الاثیر سب سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت نازل فرمائے۔

(۳۳) تینتیسویں قسم: مسلسل کی معرفت

مسلسل کبھی صفتِ روایت میں ہوتی ہے جیسے ہر راوی "سمعت" یا "حدثنا" یا "أخبرنا" وغیرہ کہے، یا صفتِ راوی میں ہوتی ہے جیسے روایت کرتے وقت وہ بات کہے جو اس کے استاذ نے کہی تھی یا وہ کام کرے جو اس کے استاد نے کیا تھا۔

....

(۱) معرفۃ علوم الحدیث (ص ۸۸)

پھر حدیث (بعض اوقات) شروع سے آخر تک مسلسل ہوتی ہے اور کبھی اس کا شروع یا آخر والا حصہ (تسلسل سے) منقطع ہوتا ہے۔

مسلسل کا فائدہ یہ ہے کہ وہ تدلیس اور انقطاع سے دور ہوتی ہے۔

اس کے باوجود کم مسلسل حدیثیں صحیح ہیں۔ [۱] واللہ اعلم

(۳۴) چونتیسویں قسم: ناسخ اور منسوخ حدیث کی پہچان

یہ فن اس کتاب کی خصوصیتوں میں سے نہیں ہے بلکہ یہ اصولِ فقہ سے زیادہ مشابہ ہے۔

لوگوں نے اس کے بارے میں بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے بہتر اور مفید کتاب حافظ فقیہ ابو بکر الحازمی رحمہ اللہ کی (الاعتبار فی بیان الناسخ والمنسوخ من الآثار) ہے۔

شافعی رحمہ اللہ کو اس فن میں ید طولیٰ حاصل تھا جیسا کہ (اُن کے شاگرد) امام احمد بن حنبل نے صراحت کی ہے۔ [۲]

ناسخ کا علم رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے ہوتا ہے، جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے: ''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا پس (اب) ان کی زیارت کرو۔'' (صحیح مسلم: ۹۷۷) وغیرہ (معلوم ہوا کہ قبروں کی زیارت سے منع والا حکم منسوخ ہے۔)

ناسخ کا علم تاریخ اور سیرت سے بھی ہوتا ہے۔ یہ اس سلسلے میں بہت زیادہ مؤید ہے جیسا کہ (امام) شافعی نے ((أفطر الحاجم والمحجوم)) سینگی لگانے اور لگوانے والے کا

---

(۱) مسلسلات پر مشہور کتابیں: الجواہر المکللہ للسخاوی، المسلسلات للسیوطی اور المناہل السلسلہ لمحمد عبد الباقی الایوبی ہیں۔

(۲) حلیۃ الاولیاء (۹/ ۹۷) وسندہ ضعیف، فیہ محمد بن حمید بن سہل ضعیف ضعفہ الجمہور، مناقب الشافعی للبیہقی (۱/ ۲۶۲) وسندہ ضعیف، فیہ ابو بکر بن العطار (القطان) النحوی ولم أعرفہ۔

روزہ ٹوٹ گیا۔[۱] والی حدیث کے بارے میں مسلک اختیار کیا ہے۔ یہ حدیث فتح مکہ کے موقع پر (سیدنا) جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ وہ فتح مکہ سے چند مہینے پہلے موتہ میں (جہاد کرتے ہوئے) شہید ہوگئے تھے اور (سیدنا عبداللہ) ابن عباس والی روایت ((احتجم وهو صائم محرم)) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سینگی لگوائی اور آپ حالتِ احرام میں روزہ دار تھے۔[۲]

ابن عباس تو اپنے والد (سیدنا) عباس (بن عبدالمطلب) کے ساتھ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔

رہا صحابی کا یہ قول کہ "یہ اس کا ناسخ ہے" تو علمِ اصول کے بہت سے ماہرین نے اسے قبول نہیں کیا ہے کیونکہ یہ اجتہاد کی قسم ہے جس میں غلطی لگ سکتی ہے۔ انھوں نے صحابی کی اس بات "یہ اس سے پہلے تھا" کو قبول کیا کیونکہ وہ اس میں راوی ہیں اور وہ ثقہ مقبول الروایت راوی ہیں۔[۳]

---

(۱) سنن ابی داود (۲۳۶۷) وسندہ صحیح وھو من الاحادیث المتواترۃ۔

(۲) ابن ماجہ (۱۶۸۲) وسندہ ضعیف وللحدیث شواہد ضعیفۃ عند الطبرانی (الاوسط: ۲۴۵۵) واحمد (۳۱۵/۱) وغیرہما وروی البخاری (۱۹۳۸) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم. (وسندہ صحیح)

(۳) صحابی کے قول "یہ اس کا ناسخ ہے" کے مقابلے میں اگر کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے تو علمِ اصول کے ان ماہرین کے اجتہادات کے مقابلے میں وہی مقدم اور راجح ہے۔ والحمد للہ

(۳۵) پینتیسویں قسم: الفاظِ حدیث کے متن وسند کے لحاظ سے ضبط کی معرفت اور تصحیف (غلطی) سے بچنا

اس میں بہت سے (ایسے) حفاظِ حدیث وغیرہ مبتلا ہوئے جنھوں نے صحیح طریقے سے علمِ حدیث حاصل نہیں کیا تھا اور وہ اس کے ماہرین میں سے نہیں تھے۔

عسکری (مشہور محدّث) نے اس (علم) میں ایک بڑی جلد لکھی ہے (جو تین جلدوں میں چھپی ہے) عام طور پر ایسی غلطیوں میں وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو صحیفوں (کتابوں) سے علم حاصل کرتے ہیں، ان کا ایسا کوئی حافظ استاذ نہیں ہوتا جو اُن کی اصلاح کرے۔

بہت سے لوگ عثمان بن ابی شیبہ (مشہور محدث) سے جو بیان کرتے ہیں کہ انھیں قراءتِ قرآن میں غلطیاں لگتی تھیں، بہت ہی زیادہ عجیب وغریب ہے کیونکہ انھوں نے تفسیر میں کتاب لکھی ہے۔ اُن کی طرف ایسی باتیں منقول ہیں جو خط کتابت سیکھنے والے (پہلی دوسری جماعت کے) چھوٹے بچوں سے بھی صادر نہیں ہوتیں۔ (۱)

بعض محدثین سے ایسی (مضحکہ خیز) باتیں وقوع پذیر ہوئی ہیں جن سے عقل مند ہنستے ہیں۔ جیسا کہ کسی سے مروی ہے کہ اس نے ((يا أبا عمير ما فعل النغير ؟)) اے ابو عمیر! چڑیا کیا ہوئی؟ کی سندیں اکٹھی کیں، پھر مجلس منعقد کر کے لوگوں کی حاضری میں وہ لکھوانے لگا: ((يا أبا عمير! مافعل البعير ؟)) اے ابو عمیر! اونٹ کا کیا ہوا؟ اس وجہ سے وہ ذلیل ہو گیا اور لوگوں نے اسے تاریخ میں لکھ لیا۔ (۲)

---

(۱) عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے بارے میں قرآن مجید صحیح یاد نہ رکھنے والی جتنی روایات ہیں، اُن میں سے ایک بھی باسند صحیح ثابت نہیں ہے۔ دیکھئے تصحیفات المحدثین للعسکری (۱/۱۴۵، ۱۴۶) الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع (۱/۲۹۸، ۲۹۹) اور میزان الاعتدال (بحاشیتی ج ۳ ص ۳۷، دوسرا نسخہ ص ۴۹، ۵۰)

(۲) معرفۃ علوم الحدیث للحاکم (ص ۱۴۶ ح ۳۷۶) اس کی سند ابو العباس احمد بن محمد بن عیسیٰ الوراق کے مجروح ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

اسی طرح (ایک دن) اتفاق ہوا کہ بغداد میں مدرسہ نظامیہ کا ایک استاذ اپنی پہلی مجلس میں حدیث: ((صلوۃ في إثر صلوۃ کتاب في علیین)) نماز کے پیچھے نماز (پڑھنے) پر علیین میں ایک کتاب لکھی جاتی ہے۔ لکھواتے ہوئے کہنے لگا: ((کنار في غلس)) جب حاضرین کو سمجھ نہ آئی تو کسی نے انھیں سمجھایا کہ اسے غلطی لگ گئی ہے اور صحیح لفظ ((کتاب فی علیین)) ہے۔[1] اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابن الصلاح نے یہاں بہت سی چیزیں بیان کی ہیں۔

ہمارے شیخ حافظِ کبیر، ماہر ابو الحجاج المزی رحمہ اللہ (تصحیفات کے) اس مقام سے لوگوں میں سب سے دُور تھے۔ آپ سب سے بہترین طریقے پر سند اور متن بیان کرتے بلکہ ہمارے علم کے مطابق رُوئے زمین پر اس فن میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جب کوئی شخص آپ کے سامنے ایسی غریب روایت بیان کرتا جیسے بعض شارحین حدیث مشہور (سند و متن) کے خلاف ذکر کرتے ہیں تو آپ فرماتے: یہ اس تصحیف (غلطی) میں سے ہے جس کے مرتکب نے صرف کتابوں سے ہی علم حاصل کیا ہے۔

(۳۶) چھتیسویں قسم: مختلف الحدیث کی پہچان

(امام) شافعی نے اس بارے میں اپنی کتاب ''الام'' میں ایک جلد کے برابر ایک لمبی فصل لکھی ہے۔ (دیکھئے الام: مجلد واحد ص ۱۷۱۴ طبع بیت الافکار الدولیہ)

اسی طرح (عبداللہ بن مسلم) ابن قتیبہ (الدینوری) نے اس بارے میں ایک مفید کتاب (مختلف الحدیث) لکھی ہے۔ اس میں ابن قتیبہ کے پاس جو علم تھا، اس لحاظ سے ردی اور فضول چیزیں بھی ہیں۔

دو حدیثوں کے درمیان تعارض کی صورت میں اگر کسی طرح جمع (و تطبیق) نہ ہو سکے،

....

(۱) ذیل تاریخ بغداد لابن النجار (۱۶/ ۳۹۳) اس کی سند غیر واحد کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

جیسے ناسخ ومنسوخ تو منسوخ کوترک کر کے ناسخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات جمع (وتطبیق) ممکن ہوتی ہے مگر بعض مجتہدین کو معلوم نہیں ہوتی لہٰذا اس میں توقف کیا جاتا ہے تاکہ وجوہِ ترجیح میں سے کوئی قسم ظاہر ہو جائے یا پھر وہ (مجتہد و عالم) جرأت کر کے کسی ایک پر فتویٰ دے دیتے ہیں یا کبھی اِس پر فتویٰ دیتے ہیں اور کبھی اُس پر، جس طرح احمد (بن حنبل) روایاتِ صحابہ کے بارے میں کرتے تھے۔

امام ابوبکر (محمد بن اسحاق) ابن خزیمہ فرماتے تھے: ہر لحاظ سے دو متعارض حدیثیں دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اگر کسی کے پاس ایسی کوئی چیز ہو تو میرے پاس لے آئے میں ان میں تطبیق وتوفیق دے دوں گا۔ (۱)

(۳۷) سینتیسویں قسم: المزید فی (متصل) الاسانید کی پہچان

(المزید فی متصل الاسانید) اس کو کہتے ہیں کہ ایک راوی سند میں ایک راوی کا اضافہ کر دے جسے دوسرے (یا دوسروں) نے ذکر نہیں کیا ہے۔

حافظ خطیب البغدادی نے اس سلسلے میں (تمییز المزید فی متصل الاسانید کے نام سے) ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ ابن الصلاح نے کہا: انھوں نے بعض چیزیں جو ذکر کی ہیں اُن میں نظر ہے۔

ابن الصلاح نے اس قسم کی مثال اس روایت سے دی ہے جسے بعض نے عبد اللّٰه بن المبارك عن سفيان عن عبدالله [كذافي الأصلين والصواب: عبدالرحمن] ابن يزيد بن جابر: حدثني بسر بن عبيد الله: سمعت أبا إدريس يقول: سمعت واثلة بن الأسقع: سمعت أبا مرثد الغنوي يقول: سمعت رسول الله ﷺ [يقول]: ((لا تجلسوا على القبور ولا تصلوا إليها)) قبروں پر نہ بیٹھو اور

(۱) الکفایہ (ص ۴۳۲، ۴۳۳) اس کی سند متصل نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

نہ اُن کی طرف نماز پڑھو' والی روایت سے دی ہے۔(دیکھئے صحیح مسلم:۹۷۲)

دوسرے لوگوں نے اسے ابن المبارک سے بیان کیا ہے مگر سفیان (الثوری) کا واسطہ ذکر نہیں کیا۔ابو حاتم الرازی نے کہا: اس سند میں ابوادریس کا ذکر، ابن المبارک کا وہم ہے۔

(دیکھئے علل الحدیث ۱/۸۰ ح ۲۱۳، ص ۳۴۹ ح ۱۰۲۹)

پس یہ دو اضافے (ہیں جو سند میں کئے گئے) ہیں۔[1]

(۳۸) اڑتیسویں قسم: مرسل خفی کی پہچان

یہ منقطع اور معضل کو بھی عموم (کے لحاظ) سے شامل ہے۔

خطیب بغدادی نے اس سلسلے میں " التفصیل لمبهم المراسیل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

اس قسم کو قدیم وجدید دور میں صرف ناقدینِ حدیث اور ماہر (محدثین) ہی جانتے ہیں۔

ہمارے شیخ حافظ المزی اس میں امام اور عجوبۂ روزگار تھے۔اللہ اُن پر رحم کرے اور ان پر مغفرت کی بارش نازل فرمائے۔

بہت سے علماء جو ثقہ اور ضعیف راویوں کو بخوبی نہیں جانتے ، اگر ان پر کوئی سند پیش کی جائے تو وہ ظاہر سے دھوکا کھا کر، ثقہ راوی دیکھتے ہوئے اس پر صحیح ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں۔ انھیں یہ پتا نہیں چلتا کہ اس میں انقطاع ، اعضال یا ارسال ہے (یا نہیں)؟ وہ صحابی اور تابعی کے درمیان فرق نہیں کر سکتے۔اللہ ہی صحیح کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔

اس کی مثال ابن الصلاح نے اس روایت سے دی ہے جسے عوام بن حوشب نے عبداللہ بن ابی اوفی (رضی اللہ عنہ) سے بیان کیا ہے کہ جب بلال (رضی اللہ عنہ) قد قامت الصلوٰۃ کہتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے اور تکبیر کہتے۔ (دیکھئے الکامل لابن عدی ۶۵۰/۲)

---

(۱) راجح یہی ہے کہ اس روایت میں امام ابن المبارک رحمہ اللہ کو خطا نہیں لگی۔دیکھئے المقنع لابن الملقن (۴۸۳/۲) بلکہ یہ روایت دونوں طرح مروی ہے۔

امام احمد نے کہا: ''عوام نے ابن ابی اوفیٰ سے ملاقات نہیں کی'' یعنی یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ عوام نے اسے کسی ضعیف راوی سے روایت کیا (سنا) ہو۔[1] واللہ اعلم

(۳۹) انتالیسویں قسم: معرفتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین

صحابی انھیں کہتے ہیں جنھوں نے حالتِ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا (یا پایا) ہے (اور حالتِ اسلام پر ہی ان کی وفات ہوئی) چاہے انھوں نے آپ کی لمبی مصاحبت نہ پائی اور آپ سے کچھ بھی روایت نہ کیا۔ اگلے پچھلے جمہور علماء کا یہی قول ہے۔

بخاری، ابوزرعہ (الرازی) اور اسماءِ صحابہ پر کتابیں لکھنے والوں مثلاً ابن عبدالبر، ابن مندہ، ابوموسیٰ المدینی اور ابن الاثیر نے صراحت کی ہے کہ مجرد رویت (اور ملاقات) ہی صحابی ہونے کے لئے کافی ہے۔ ابن الاثیر کی یہ صراحت ان کی کتاب ''(اُسد) الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ'' میں ہے اور یہ کتاب جامع ترین، بہت زیادہ فوائد والی اور وسیع ہے۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائے۔

ابن الصلاح نے کہا: ابن عبدالبر نے (قصہ گو) مؤرخین سے مشاجراتِ صحابہ (صحابہ کی باہمی جنگوں کے قصے) لے کر اپنی کتاب ''الاستیعاب'' میں بیان کر کے اس کتاب کو داغدار کر دیا ہے۔[2]

دوسرے (علماء) کہتے ہیں: رویت (وملاقات) کے ساتھ صحابی ہونے کے لئے یہ

---

(۱) اس روایت کی سند عوام بن حوشب تک صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند کا ایک راوی حجاج بن فروخ سخت ضعیف ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد للہیثمی (۵/۳) لہٰذا اس مثال میں نظر ہے۔

(۲) مشاجراتِ صحابہ کے بارے میں مکمل سکوت کرنا چاہئے اور عوام الناس کے سامنے انھیں کبھی بیان نہیں کرنا چاہیے اِلا یہ کہ صحابۂ کرام کا دفاع کیا جائے اور شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

ضروری ہے کہ ایک دو حدیثیں بیان کریں۔

سعید بن المسیب (مشہور تابعی) سے روایت ہے کہ صحابی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک دو سال کی مصاحبت ہو یا ایک دو غزوات میں شرکت ہو۔ [۱]

شعبہ (بن الحجاج) نے موسیٰ السَّبَلانی کی تعریف کرتے ہوئے، اُن سے نقل کیا کہ میں نے انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ کے (خاص) صحابہ میں آپ کے علاوہ کوئی اور باقی (زندہ) ہے؟ انھوں نے کہا: کچھ اعرابی زندہ ہیں، جنھوں نے آپ کو دیکھا تھا مگر آپ کا کوئی (خاص) صحابی زندہ نہیں ہے۔

اسے مسلم نے ابوزرعہ کے سامنے بیان کیا تھا۔ [۲]

یہ خاص صحبت کی نفی ہے۔ جمہور کی اصطلاح کی نفی نہیں جس کے مطابق مجرد رویت (اور ملاقات) اس کے لئے کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عظیم الشان منزلت اور جلالتِ قدر کی وجہ سے ان (لوگوں) پر صحابی کا اطلاق کیا جائے۔ اس میں ان کی عظمتِ شان ہے جنھوں نے آپ کو دیکھا ہے۔

بعض صحیح احادیث میں آیا ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا:) تم جہاد کرو گے تو کہا جائے گا: کیا تمھارے درمیان ایسا شخص موجود ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے؟ پھر آپ نے فرمایا: جس نے اس کو دیکھا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا؟ الخ [۳]

....

(۱) الکفایہ (ص ۵۰) اس کی سند محمد بن عمر الواقدی راوی کی وجہ سے سخت مردود بلکہ موضوع ہے۔ نیز دیکھئے شرح التبصرہ للعراقی (۱۲/۳۔۱۳) اور حاشیہ مقدمہ ابن الصلاح (طبعہ محققہ ص ۳۹۶)

(۲) امام مسلم اور امام ابوزرعہ والی روایت تو نہیں ملی لیکن ابن عساکر (تاریخ دمشق ۲۷۸/۹ من طریق ابن سعد وفی المطبوع خطأ) نے اسے موسیٰ السبلانی (وفی تاریخ دمشق: محمد السبلانی وھو خطأ) کی سند سے نقل کیا ہے اور اس کی سند حسن لذاتہ ہے۔

(۳) دیکھئے صحیح البخاری (۲۷۴۰، ۳۳۹۹، ۳۶۴۹) اور صحیح مسلم (۲۵۳۲)

بعض (علماء) نے (سیدنا) معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور عمر بن عبدالعزیز (رحمہ اللہ) کے بارے میں کہا: معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دن عمر بن عبدالعزیز اور ان کے سارے خاندان سے بہتر ہے۔[1]

فرع (۱): اہل سنت والجماعت کے نزدیک تمام صحابہ عادل ہیں، کیونکہ اللہ نے اپنی کتابِ عزیز میں اُن کی تعریف کی ہے۔ سنتِ نبوی میں ان کے تمام اخلاق وافعال کی تعریف موجود ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی جانوں اور اموال کی قربانیاں پیش کیں، ان کا یہ مقصد تھا کہ اللہ سے اس کا بہترین اجر وثواب پائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُن میں جو اختلافات ہوئے ہیں، ان میں سے بعض تو بغیر ارادے کے ہوئے جیسے جنگِ جمل اور بعض اجتہاد سے ہوئے جیسے جنگِ صفین۔ اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی ہوتا ہے لیکن اجتہاد کرنے والا معذور ہے اگرچہ اسے غلطی لگے، اسے (ایک) اجر ملتا ہے اور اگر اجتہاد صحیح ہو تو دو اجر ملتے ہیں۔

(سیدنا) علی (رضی اللہ عنہ) اور ان کے ساتھی (سیدنا) معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور ان کے ساتھیوں کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ اللہ ان سب سے راضی ہو جائے۔

معتزلہ کا یہ کہنا کہ ''صحابہ عادل ہیں سوائے اُن کے جنھوں نے علی سے جنگ کی'' باطل، رذیل اور مردود قول ہے۔

صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے (سیدنا) حسن بن علی (رضی اللہ عنہ) کو منبر پر لا کر فرمایا: بے شک میرا یہ بیٹا سردار ہے اور (ایک دن) اللہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کروائے گا۔ (صحیح بخاری: ۲۷۰۴)

اس حدیث کا مصداق اس وقت ظاہر ہوا جب حسن (رضی اللہ عنہ) نے اپنے والد علی (رضی اللہ عنہ) کی وفات کے بعد خلافت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے حوالے کر دی تو معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر

---

(۱) اس قول کا صریح قائل نامعلوم ہے۔

چالیس (۴۰) ہجری میں اتفاق ہو گیا۔ اسے عام الجماعۃ (جماعت یا اکٹھا ہونے کا سال) کہا جاتا ہے۔ آپ (ﷺ) نے سب کو مسلمان کہا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔

(الحجرات:۹)

اللہ نے مسلمانوں کی باہمی جنگ کے باوجود انھیں مومنین قرار دیا ہے۔

معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کون سے صحابہ تھے؟

کہا جاتا ہے کہ دونوں فریقین کے ساتھ سو (۱۰۰) صحابہ (بھی) نہیں تھے [اور احمد سے روایت (؟) ہے کہ تیس (۳۰) بھی نہیں تھے۔] واللہ اعلم

اور سارے صحابہ عادل (اور سچے) تھے۔

رہے رافضیوں کے گروہ اور ان کی جہالت وکم عقلی اور یہ دعویٰ کہ صحابہ نے کفر کیا تھا سوائے سترہ صحابیوں کے اور رافضیوں کے نے ان سترہ کے نام بتائے ہیں، یہ مُردہ ذہن اور پے در پے بدعات کا ہذیان (اور بکواس) ہے جس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ صرف فاسد رائے نے اسے گھڑا ہے۔

یہ دعویٰ اس حیثیت میں نہیں ہے کہ اُس پر رد کیا جائے۔ اس کے خلاف دلائل بہت واضح اور مشہور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کا آپ کے احکامات پر عمل مشہور ومعروف ہے۔ صحابہ نے آپ کے بعد مختلف ممالک اور علاقے فتح (اور مشرّف بہ اسلام) کیے، انھوں نے کتاب وسنت کی تبلیغ کی، لوگوں کو جنت کے راستے پر چلایا۔ نماز، زکوٰۃ اور شعائرِ اسلام پر ہر وقت اور ہر حال میں مسلسل عمل کیا۔ وہ دلیری اور کمال، کرم وایثار اور ایسے بہترین اخلاق والے تھے جن کی کوئی مثال نہ تو سابقہ اُمتوں میں ملتی ہے اور نہ بعد میں کوئی اُن جیسا ہوا ہے۔ اللہ اُن سب سے راضی ہو جائے اور اللہ ان لوگوں پر لعنت کرے جو سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا سمجھتے ہیں۔ آمین یا ربّ العالمین

انبیاء (اور رسولوں) علیہم السلام کے بعد تمام صحابہ بلکہ تمام مخلوقات میں سب سے افضل ابوبکر

عبداللہ بن عثمان (بن عامر) التیمی، رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ (بلا فصل) ہیں۔

آپ نے تمام لوگوں سے پہلے رسول ﷺ کی تصدیق کی، اس وجہ سے آپ کو صدّیق کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے جسے بھی ایمان کی دعوت دی ہے اُسے لغزش ہوئی ہے سوائے ابوبکر کے، انھوں نے کوئی پس وپیش اور ہچکچاہٹ نہیں کی۔ (۱)

میں نے آپ کی سیرت، فضائل، بیان کردہ روایات اور فتاویٰ علیحدہ ایک جلد میں لکھے ہیں۔ وللہ الحمد

پھر آپ کے بعد عمر بن الخطاب پھر عثمان بن عفان (اور) پھر علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم اجمعین درجہ بدرجہ سب سے افضل ہیں۔) مہاجرین وانصار کی یہی رائے ہے۔ جب (سیدنا) عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے بعد چھ آدمیوں میں شوریٰ قائم کی۔ پھر عثمان وعلی (کی خلافت) پر بات رُک گئی۔

(سیدنا) عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) نے تین دن اور تین راتیں پوری کوشش کی، انھوں نے باپردہ عورتوں اور مدرسوں کے چھوٹے بچوں تک سے پوچھا، سب کے سب (سیدنا) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو ہی خلیفہ بنانا چاہتے تھے تو انھوں نے عثمان کو (سیدنا) علی (رضی اللہ عنہ) پر مقدم کر کے خلیفہ مقرر کر دیا۔ (۲)

....

(۱) اسے امام محمد بن اسحاق بن یسار نے محمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن الحصین التمیمی سے روایت کیا ہے۔ دیکھئے السیرۃ النبویہ لابن اسحاق (ص ۱۸۳) وعنہ البیہقی فی دلائل النبوہ (۲/۱۶۴) وابن الاثیر فی اسد الغابہ (۳/۲۰۶) اس کی سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۲) یہ روایت ان الفاظ (باپردہ عورتوں اور چھوٹے بچوں سے مشورے والی بات) کے ساتھ باسند متصل کہیں نہیں ملی۔ صحیح بخاری کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ لوگ عثمان پر (خلافت میں) کسی کو ترجیح نہیں دیتے۔ پھر مہاجرین وانصار نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

(دیکھئے ح ۷۲۰۷، ۳۷۰۰)

اسی لئے (امام) دارقطنی نے فرمایا: جو شخص علی کو عثمان (رضی اللہ عنہما) پر مقدم کرتا ہے تو وہ تمام مہاجرین اور انصار کو تکلیف دیتا ہے۔ (۱)

اور انھوں (دارقطنی) نے سچ فرمایا، اللہ اُن سے راضی ہو جائے اور بہترین ٹھکانا جنت فردوس عطا فرمائے تعجب ہے کہ کوفہ کے بعض اہلِ سنت (سیدنا) علی کو (سیدنا) عثمان پر (فضیلت میں) مقدم سمجھتے تھے۔!

ایسا قول سفیان ثوری سے مروی ہے (جس کی سند کا کوئی اتا پتا نہیں ہے) لیکن کہا جاتا ہے کہ انھوں نے رجوع کر لیا تھا۔ (۲)

اور اسی طرح وکیع بن الجراح سے (بھی) مروی ہے۔ ابن خزیمہ اور خطابی نے اس کی حمایت کی ہے۔ (۳) لیکن سابقہ دلائل کی رُو سے یہ (قول) ضعیف و مردود ہے۔

پھر (افضیلت میں) باقی عشرہ مبشرہ، پھر اہلِ بدر، پھر اہلِ اُحد پھر حدیبیہ والے دن بیعتِ رضوان (کرنے) والے ہیں۔

سابقین اولین انھیں کہا جاتا ہے جنھوں نے قبلتین (بیت المقدِس اور مکہ) کی طرف نمازیں پڑھی ہیں۔ بعض کہتے ہیں ان سے مراد بدری صحابہ ہیں اور بعض بیعتِ رضوان

....

(۱) یہ حوالہ (باسند متصل) نہیں ملا۔

(۲) سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: جس نے علی کو ابو بکر اور عمر پر مقدم کیا تو اس نے مہاجرین اور انصار پر عیب لگایا، مجھے اس کا خوف ہے کہ اسے اس کے ساتھ کوئی عمل نفع نہیں دے گا۔ (المعرفہ والتاریخ ۲/۱۶۷ وسندہ حسن لذاتہ، المعجم لابن الاعرابی ۲/۲۵۷ ح ۱۷۸۴، ولہ شاہد ضعیف عند ابی نعیم فی الحلیہ ۷/۲۸) غالباً اس قول سے علماء نے رجوع کا استدلال کیا ہے۔ سفیان ثوری کا ایک قول خطابی نے اہلِ کوفہ کی تائید میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے معالم السنن (۷/۱۸) لیکن اس کی سند خطابی کے استاذ محمد بن ہاشم (توثیق نامعلوم) اور سفیان ثوری کے شاگرد عبدالصمد (کا تعین نامعلوم ہونے) کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۳) وکیع، ابن خزیمہ اور خطابی کے حوالے باسند صحیح متصل نہیں ملے۔ بے سند اقوال کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ خطابی نے اہلِ کوفہ کے قول کو ترجیح نہیں دی۔ دیکھئے معالم السنن (ج ۷ ص ۱۸۔۱۹ ح ۴۴۶۲)

والوں کو سابقین اولین (اسلام قبول کرنے میں پہل کرنے والے) سمجھتے ہیں۔
اس کے بارے میں دوسرے اقوال بھی ہیں۔ واللہ اعلم

فرع (۲): شافعی نے فرمایا: ساٹھ ہزار کے قریب صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے اور آپ سے روایت بیان کی ہے۔[۱]

ابوزرعہ الرازی نے کہا: آپ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقعے پر چالیس ہزار صحابہ حاضر تھے۔ تبوک میں ستر ہزار تھے اور آپ کی وفات کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ تھے۔[۲]

احمد بن حنبل نے کہا: (صحابہ میں) سب سے زیادہ روایت کرنے والے چھ ہیں:
انس (بن مالک)، جابر (بن عبداللہ الانصاری)، ابن عباس، ابن عمر، ابو ہریرہ اور عائشہ (رضی اللہ عنہم اجمعین)[۳]

میں (ابن کثیر) نے کہا: اور عبداللہ بن عمرو، ابوسعید (الخدری) اور ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) لیکن وہ پہلے (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں) فوت ہوگئے تھے، اسی لئے احمد بن حنبل نے انھیں عبادِلہ میں شمار نہیں کیا بلکہ فرمایا: عبادلہ چار ہیں: عبداللہ بن الزبیر، ابن عباس، ابن عمر اور عبداللہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہم)[۴]

---

(۱) مناقب الشافعی للساجی (بحوالہ التقیید والایضاح ص ۳۰۶ وقال العراقي: "وهذا إسناد جيد")

(۲) الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع (۲/۲۹۳ ح ۱۸۹۴) اس کی سند عبیداللہ بن محمد عرف ابن بطہ العکبری کی وجہ سے ضعیف ہے اور باقی سند میں بھی نظر ہے۔

(۳) یہ قول باسند متصل نہیں ملا۔ نیز دیکھئے کتاب العلل للامام احمد (۱۸۷۳) اور طبقات ابن سعد (۲/۳۵۱)

(۴) یہ قول باسند متصل نہیں ملا۔ نیز دیکھئے کتاب: بحر الدم (۵۶۱ روایۃ مھنیٰ)

فرع (۳): آزاد مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر الصدیق (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ مطلقاً سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔[1]

بچوں میں علی (رضی اللہ عنہ) سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مطلقاً سب سے پہلے مسلمان ہوئے[2] اور اس کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

موالی (آزاد کردہ غلاموں) میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور غلاموں میں بلال (رضی اللہ عنہ) سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔

عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا) سب سے پہلے مسلمان ہوئیں اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ مطلقاً سب سے پہلے مسلمان ہوئیں بعثتِ مبارکہ کے شروع والی روایات سے (یہی) ظاہر ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۳، ۳۳۹۲، ۴۹۵۳)

اور یہی قول ابن عباس (رضی اللہ عنہ)، زہری، قتادہ، محمد بن اسحاق بن یسار امام المغازی اور ایک جماعت سے مروی ہے۔[3]

---

(۱) سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں سب سے پہلے مسلمان نہیں ہوا تھا؟ (سنن الترمذی: ۳۶۶۷ وسندہ صحیح ولا یضرہ من أرسلہ، صحیح ابن حبان، الاحسان: ۶۸۲۴/ ۶۸۶۳)

محمد بن المنکدر، ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن اور صالح بن کیسان وغیرہم اس میں شک نہیں کرتے تھے کہ سب سے پہلے اسلام لانے والے ابوبکر تھے۔ (فضائل الصحابہ للامام احمد ۱/ ۲۳۲ ح ۲۶۱ وسندہ صحیح، معجم الصحابہ للبغوی ۳/ ۴۴۸ ح ۱۳۸۲، وسندہ صحیح) ابراہیم نخعی بھی یہی کہتے تھے۔

(دیکھئے فضائل الصحابہ للامام احمد ۱/ ۲۲۴ ح ۲۶۳ وسندہ صحیح، ۲/ ۵۹۰ ح ۱۰۰۰، وسندہ صحیح)

(۲) سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سب سے پہلے علی بن ابی طالب مسلمان ہوئے تھے۔

(فضائل الصحابہ للامام احمد ۲/ ۵۹۰ ح ۱۰۰۰، وسندہ صحیح)

(۳) زہری کا قول: سب سے پہلے خدیجہ ایمان لائیں (التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ: ۹۲ وسندہ حسن)

محمد بن اسحاق کا قول (السیرۃ النبویہ ص ۱۸۳) قتادہ کا قول (التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ: ۹۴ وسندہ ضعیف جداً)

ابن عباس کا قول (؟)

مفسر ثعلبی نے اس پر اجماع کا دعویٰ کر کے کہا: اختلاف تو اُن میں ہے جو بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ [1]

فرع (۴): صحابہ میں آخری صحابی انس بن مالک فوت ہوئے پھر اُن کے بعد ابوالطفیل عامر بن واثلہ اللیثی فوت ہوئے۔علی بن المدینی نے کہا: ان (ابوالطفیل) کی وفات مکہ میں ہوئی، اس لحاظ سے وہ سب سے آخری فوت ہونے والے صحابی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مکہ میں سب سے آخری فوت ہونے والے ابن عمر ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جابر ہیں۔صحیح یہ ہے کہ سہل بن سعد یا سائب بن یزید (مدینہ میں) سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ بصرہ میں انس (بن مالک) کوفہ میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ، شام (حمص) میں عبداللہ بن بسر، دمشق میں واثلہ بن الاسقع، مصر میں عبداللہ بن حارث بن جزء (الزبیدی)، یمامہ میں ہرماس بن زیاد، جزیرہ میں عرس بن عَمیرہ، افریقہ میں رویفع بن ثابت اور بادیہ (جنگل وصحرا) میں سلمہ بن الاکوع سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ایک قول یہ ہے کہ سلمہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں فوت ہوئے۔رضی اللہ عنہم اجمعین

فرع (۵): صحابی کا صحابی ہونا بعض اوقات تواتر سے ثابت ہوتا ہے اور بعض اوقات مستفیض (ومشہور) روایات سے، بعض اوقات دوسرے صحابہ کی گواہی اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر کا آپ سے سُنی ہوئی یا مشاہدے والی روایت بیان کرنے سے صحابی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ کا سچا معاصر کہے: ''میں صحابی ہوں'' تو ابن الحاجب نے اپنی (کتاب) ''مختصر'' میں کہا: (اس کے قبول اور رد میں) اختلاف کا احتمال ہے کیونکہ وہ حکم شرعی کے بارے میں بتا رہا ہے جیسے کہ وہ کسی ناسخ روایت کے بارے میں کہے: ''یہ فلاں روایت کی ناسخ ہے'' اس میں خطا کا احتمال ہے۔ (دیکھئے منتہی الوصول ص ۸۰)

اگر وہ کہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا یا یہ کرتے ہوئے دیکھا یا

(۱) حوالہ نہیں ملا۔ واللہ اعلم

ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، وغیرہ تو یہ بلا شک وشبہ مقبول ہے بشرطیکہ صحابی تک سند صحیح ہو اور وہ آپ ﷺ کا معاصر ہو۔(۱)

(۴۰) چالیسویں قسم: تابعین کی پہچان

خطیب بغدادی نے کہا: تابعی وہ ہے جس نے صحابی کی مصاحبت اختیار کی ہو۔ (الکفایہ ص ۵۹)

حاکم کے کلام کا یہ تقاضا ہے کہ جس نے کسی صحابی سے ملاقات کی اور روایت بیان کی، اگرچہ اس کی مصاحبت اختیار نہیں کی تو وہ مطلقاً تابعی ہے۔ (دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۲)

میں (ابن کثیر) نے کہا: انھوں نے صحابی کی مجرد رویت پر اکتفا نہیں کیا جیسا کہ انھوں نے نبی ﷺ کی مجرد رویت (اور ملاقات) پر صحابی ہونے کا اطلاق کیا ہے۔ وجۂ فرق یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رویت کو عظیم فضیلت حاصل ہے۔(۲)

حاکم نے تابعین کے پندرہ طبقے مقرر کئے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اعلیٰ طبقہ وہ ہے جنھوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے ان میں سے سعید بن المسیب، قیس بن ابی حازم، قیس بن عبّاد، ابوعثمان النہدی، ابووائل، ابورجاء العطاردی اور ابوساسان حضین بن المنذر وغیرہم کو ذکر کیا۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۲)

حاکم پر اس کلام میں کئی مواخذات ہیں۔ ابن خراش (رافضی) نے کہا کہ عشرہ مبشرہ سے

---

(۱) ابن الحاجب کا قول مردود ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگر نبی ﷺ کا سچا معاصر یہ کہے کہ "میں صحابی ہوں" تو ہم یقیناً اسے صحابی سمجھتے ہیں۔ والحمدللہ

تنبیہ: ایک سو دس ہجری (۱۱۰ھ) کے بعد زمین پر جو شخص (چاہے انسان ہو یا جن) اگر صحابی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ شخص جھوٹا ہے اور اس کا دعویٰ مردود ہے۔

(۲) راجح یہی ہے کہ صحابی کو ایک دفعہ بھی دیکھنے یا ملاقات کرنے والا تابعی ہے چاہے اس نے روایت کی ہو یا نہ کی ہو۔ تابعین کی کئی اقسام ہیں: بعض کبار تابعین ہیں اور بعض صغار، مجرد رویت والا اصغار تابعین میں سے ہے۔ واللہ اعلم

تابعین میں قیس بن ابی حازم کے سوا کسی نے روایت بیان نہیں کی۔ [1]

ابوبکر بن ابی داود (السجستانی) نے کہا: قیس بن ابی حازم نے عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) سے نہیں سنا۔ [2] واللہ اعلم

سعید بن المسیب نے تو بالاجماع (ابوبکر) الصدیق (رضی اللہ عنہ) کو نہیں پایا کیونکہ وہ عمر (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کے دو سال بعد یا آخری دو سالوں سے پہلے پیدا ہوئے۔ اسی لئے (سیدنا) عمر (رضی اللہ عنہ) سے اُن کے سماع میں اختلاف ہے۔

حاکم نے کہا: انھوں نے عمر اور ان کے بعد (باقی) عشرہ مبشرہ سے ملاقات کی ہے۔

(معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۵)

یہ بھی کہا گیا کہ انھوں (سعید بن المسیب) نے عشرہ مبشرہ میں سے صرف سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) سے سُنا ہے [3] اور وہ (سعد رضی اللہ عنہ) ان عشرہ مبشرہ میں سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ واللہ اعلم

حاکم نے کہا: ان تابعین میں وہ لوگ بھی ہیں جو صحابہ کی اولاد میں سے تھے اور نبی ﷺ

---

(۱) تاریخ بغداد للخطیب (۱۲/۴۵۴ وسندہ ضعیف) اس کی سند کے راوی محمد بن محمد بن داود بن عیسیٰ الکرجی کے حالات نہیں ملے۔ واللہ اعلم

(۲) ابوبکر بن ابی داود کا قول باسند متصل نہیں ملا لیکن امام ابوداود سے ایک ضعیف السند قول سؤالات الآجری (۴۵) اور تاریخ بغداد (۱۲/۴۵۴) وغیرہما میں مروی ہے۔ ضعف کی وجہ یہ ہے کہ ابوعبید الآجری غیر موثق ہونے کی وجہ سے مجہول الحال ہے۔

(۳) یہ قول کئی وجہ سے غلط ہے۔ مثلاً: سعید بن المسیب کی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت صحیح بخاری (۴۷۵) میں ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اُن کی روایت صحیح بخاری (۱۵۶۹) اور صحیح مسلم (۱۲۲۳) میں ہے۔ سعید بن المسیب نے عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ حج کیا تھا۔ (سنن النسائی ۵/۱۵۲ ح ۲۷۴۴، وسندہ حسن) سعید بن المسیب نے سیدنا عثمان اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما دونوں سے سماع کی تصریح کی ہے۔ (العلل للامام احمد ۲/۲۱۴ ح ۲۰۵۳ وسندہ حسن)

کی زندگی میں پیدا ہوئے مثلاً عبداللہ بن ابی طلحہ، ابو امامہ بن سہل بن حنیف اور ابو ادریس الخولانی۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۵)

میں (ابن کثیر) نے کہا: عبداللہ بن ابی طلحہ جب پیدا ہوئے تو اُن کے ماں جائے بھائی انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ نے اُن کے منہ میں گھٹی ڈالی، برکت کی دعا فرمائی اور عبداللہ نام رکھا۔ ایسے شخص کو مجرد رویت کی وجہ سے صغار صحابہ میں ذکر کرنا چاہیے (بعض) لوگوں نے (ابو القاسم) محمد بن ابی بکر الصدیق کو بھی صغار صحابہ میں ذکر کیا ہے حالانکہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر (مدینہ طیبہ کے قریب ذوالحلیفہ/ ابیار علی والے) درخت کے پاس (اپنی والدہ کے) احرام کے وقت پیدا ہوئے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے صرف ایک سو دن پائے۔

یہ مذکور نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر کیے گئے یا آپ نے انھیں دیکھا۔[۱]

محمد بن ابی بکر کے مقابلے میں عبداللہ بن ابی طلحہ کو صغار صحابہ میں شمار کرنا زیادہ راجح ہے۔[۲]

واللہ اعلم

حاکم نے نعمان بن مقرن اور سوید بن مقرن کو تابعین میں ذکر کیا ہے حالانکہ یہ دونوں صحابی ہیں۔ (دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵۴)

مُخَضْرَمِین اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسلمان ہوئے اور آپ کو نہیں دیکھا۔

---

(۱) حافظ ابن حجر نے کہا: "له رؤية ... وكان عليّ يثني عليه" وہ رویت کے لحاظ سے صحابی تھے... اور علی (رضی اللہ عنہ) ان کی تعریف کرتے تھے۔ (تقریب التہذیب: ۵۷۶۴) واللہ اعلم

(۲) جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے یا ملاقات کی ہے اور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ہے یا چاہے وہ شخص صرف ایک دن کا ہی تھا تو وہ صحابی ہے۔ اسے صغار صحابہ میں شمار کیا جائے گا۔ ابو امامہ اسعد بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بھی رویت کے لحاظ سے صغار صحابہ میں ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین

مُخَضرَ مہ کٹ جانے کو کہتے ہیں۔گویا کہ یہ اپنے ہم عصر صحابہ کرام سے کٹ گئے۔

(امام) مسلم نے ان میں بیس کے قریب اشخاص کو شمار کیا ہے۔ان میں ابوعمرو الشیبانی، سوید بن غفلہ، عمرو بن میمون، ابوعثمان النہدی، ابوالحلال (ربیعہ بن زرارہ) العتکی، عبد خیر بن یزید الخیوانی اور ربیعہ بن زرارہ (ابوالحلال العَتکی) ہیں۔

(دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث ص ۴۴)

ابن الصلاح نے کہا: مسلم نے ابومسلم عبداللہ بن ثُوب الخولانی کو ذکر نہیں کیا۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: عبداللہ بن عکیم اور احنف بن قیس کو (بھی) ذکر نہیں کیا۔

اس میں اختلاف ہے کہ افضل التابعین کون ہے؟ مشہور یہ ہے کہ سعید بن المسیب (افضل التابعین) ہیں جیسا کہ احمد بن حنبل وغیرہ نے کہا ہے۔[1]

اہلِ بصرہ نے کہا: حسن (بصری) ہیں۔

اہلِ کوفہ نے کہا: علقمہ اور اسود (بن یزید) ہیں۔

بعض اہلِ مکہ نے کہا: عطاء بن ابی رباح ہیں۔

سیدات تابعیات حفصہ بنت سیرین، عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور ام الدرداء الصغریٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

سادات تابعین میں سے حجاز کے فقہاءِ سبعہ ہیں:

(۱) سعید بن المسیب (۲) قاسم بن محمد (۳) خارجہ بن زید (بن ثابت) (۴) عروہ بن الزبیر (۵) سلیمان بن یسار اور (۶) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ۔

کہا گیا ہے کہ ساتویں ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف یا ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث

---

(۱) امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب یہ قول تہذیب الکمال میں بغیر کسی سند کے عثمان الحارثی النحاس (؟) سمعت احمد.....الخ سے مروی ہے۔(۳/۲۰۰) یعنی یہ قول ثابت نہیں ہے۔

سلیمان بن موسیٰ نے سعید بن المسیب کو افقہ التابعین قرار دیا۔(الجرح والتعدیل ۴/۶۱ وسندہ حسن)

بن ہشام ہیں۔ بعض نے تابعین میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جو تابعین نہیں ہیں اور بعض نے تابعین میں انھیں شامل نہیں کیا جو تابعین تھے۔

اسی طرح بعض نے ان لوگوں کو صحابہ میں ذکر کر دیا ہے جو کہ صحابہ میں سے نہیں تھے۔

اسی طرح انھوں نے صحابہ کی ایک جماعت کو تابعین میں ذکر کر دیا ہے۔

یہ اُن کے مبلغِ علم کے مطابق ہے اور اللہ ہی صحیح بات کی طرف توفیق دینے والا ہے۔ (۱)

(۴۱) اکتالیسویں قسم: اصاغر سے روایتِ اکابر کی پہچان

بڑی قدر وشان والے یا بڑی عمر والے اپنے سے نچلے درجے کے راویوں سے روایت کرتے رہے ہیں۔ اس باب میں سب سے اہم واعلیٰ وہ روایت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں تمیم داری (رضی اللہ عنہ) سے بیان کی ہے۔ تمیم داری نے آپ کو بتایا تھا کہ انھوں نے ایک سمندری جزیرے میں دجال کو دیکھا ہے۔ یہ حدیث صحیح (مسلم: ۲۹۴۲) میں ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری (۷۴۶۰) میں معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے جو انھوں نے مالک بن یخامر (تابعی کبیر) سے انھوں نے معاذ (رضی اللہ عنہ) سے بیان کی ہے کہ حدیث: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا حتیٰ کہ...... (کی تشریح میں فرمایا:) وہ شام میں ہوں گے۔

ابن الصلاح نے کہا: عَبادلہ (ابن عباس، ابن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص اور عبداللہ بن الزبیر) نے کعب الاحبار (تابعی) سے روایت بیان کی ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اس (کعب الاحبار) سے عمر، علی، (ابو ہریرہ) اور صحابہ کی ایک

---

(۱) جس تابعی کے صحابی ہونے میں اختلاف ہو اور کم از کم ایک محدث سے اُن کی توثیق ثابت ہو تو وہ صدوق حسن الحدیث کے درجے پر ہوتے ہیں، بشرطیکہ اُس پر جمہور کی جرح ثابت نہ ہو یا صحابہ میں اس کا شمار خطأ فاحش نہ ہو۔ دیکھئے التلخیص الحبیر (۱/۴۷ ح ۷۰) اور نیل المقصود فی التعلیق علیٰ سنن ابی داود (ج ۱ ص ۶۹ ح ۱۶۲)

جماعت نے حکایات بیان کی ہیں۔

زہری اور یحییٰ بن سعید الانصاری نے (امام) مالک سے روایت بیان کی ہے حالانکہ یہ دونوں اُن کے استاذ ہیں۔

عمرو بن شعیب سے تابعین کی ایک جماعت نے روایت بیان کی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ بیس سے زیادہ یا ستر سے زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم

اگر ہم ان سب کے واقعات ذکر کرتے تو یہ فصل بہت لمبی ہو جاتی۔

ابن الصلاح نے کہا: اس پر تنبیہ میں یہ فائدہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ کی قدر معلوم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا: عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگوں کو اُن کے مقام و مرتبے پر رکھیں۔ (۱)

(۴۲) بیالیسویں قسم: مُدَبَّج کی پہچان

ہم عمر اور ہم سند اُقران (ہم عمر لوگوں) کی ایک دوسرے سے روایت کو مُدَبَّجُ کہتے ہیں۔

حاکم نے مقاربتِ سند پر اکتفا کیا ہے، اگر عمر میں مختلف ہوں لہٰذا ان میں سے جب بھی کوئی دوسرے سے روایت کرے گا تو اسے مدبج کہا جائے گا جیسے ابو ہریرہ اور عائشہ (رضی اللہ عنہما) زہری اور عمر بن عبدالعزیز، مالک اور اوزاعی، احمد بن حنبل اور علی بن المدینی۔

(دیکھئے معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۱۷، ۲۱۸)

اگر ایسا کوئی (ہم مرتبہ شخص) دوسرے سے روایت نہ کرے تو اسے مدبج نہیں کہا جاتا۔ (۲)

واللہ اعلم

---

(۱) یہ روایت صحیح مسلم کے مقدمے میں بغیر سند کے بصیغۂ تمریض مذکور ہے۔ اسے ابوداود نے منقطع یعنی ضعیف سند سے روایت کیا ہے لہٰذا اسے صحیح ثابت کہنا غلط ہے۔ واللہ اعلم

(۲) القاموس الوحید میں ہے کہ "المدبج: (۱) اصطلاحِ حدیث میں وہ روایت ہے جسے ایسے چند راویوں نے بیان کیا ہو جو عمر و سند کے لحاظ سے یکساں ہوں (۲) مزین کیا ہو......" (ص ۴۹۷)]

(۴۳) تینتالیسویں قسم: روایت کرنے والے بھائیوں اور بہنوں کی پہچان

اس میں (علماء کی) ایک جماعت نے کتابیں لکھی ہیں جن میں علی بن المدینی (کی کتاب: تسمیة من روی عنه من أولاد العشرة) اور ابو عبدالرحمٰن النسائی ہیں۔

دو بھائیوں کی مثال عبداللہ بن مسعود اور ان کے بھائی عتبہ ہیں۔

عمرو بن العاص اور ان کے بھائی ہشام

زید بن ثابت اور ان کے بھائی یزید

تابعین میں عمرو بن شُرَحبیل ابو میسرہ اور ان کے بھائی ارقم، یہ دونوں (سیدنا) عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں سے ہُزَیل بن شرحبیل اور ان کے بھائی ارقم [1]

تین بھائی: سہل، عباد اور عثمان، تینوں حنیف کے بیٹے ہیں۔

عمرو بن شعیب اور ان کے دو بھائی: عمر اور شعیب۔

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اور ان کے دو بھائی: اسامہ اور عبداللہ۔

چار بھائی: سہیل بن ابی صالح اور ان کے (تین) بھائی: عبداللہ جسے عباد بھی کہتے ہیں، محمد اور صالح

پانچ بھائی: سفیان بن عیینہ اور ان کے چار بھائی: ابراہیم، آدم، عمران اور محمد

حاکم نے کہا: میں نے حافظ ابو علی الحسین بن علی (النیسابوری) کو فرماتے سُنا کہ ان سب نے حدیثیں بیان کی ہیں۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵۵ ح ۴۰۴)

چھ بہن بھائی: محمد بن سیرین اور ان کے (پانچ) بہن بھائی: انس، معبد، یحییٰ، حفصہ اور

---

(۱) ابن الملقن کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ارقم بن شرحبیل ایک آدمی ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ وہ عمرو کا بھائی تھا یا ہُزَیل کا؟ اور ظاہر یہ ہے کہ وہ عمرو کا بھائی ہے۔ دیکھئے المقنع (۲/۵۲۴)

کریمہ، اسی طرح نسائی اور یحییٰ بن معین نے بھی انھیں ذکر کیا ہے۔

حافظ ابو علی النیسابوری نے ان میں کریمہ کو ذکر نہیں کیا۔

(دیکھئے مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۱۲ بحوالہ تاریخ نیسابور للحاکم)

اس لحاظ سے یہ سابقہ قسم (پانچ بھائیوں والی) میں شمار ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عمر والے معبد اور سب سے کم عمر والی حفصہ تھیں۔ [1]

محمد بن سیرین نے اپنے بھائی یحییٰ سے انھوں نے اپنے بھائی انس سے انھوں نے اپنے مولیٰ انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لبيك حقًّا حقًّا، تعبّدًا ورِقًّا)) (اے اللہ) حاضر ہوں حق اور سچائی کے ساتھ، بندگی اور غلامی کے ساتھ۔ [2]

سات بھائیوں کی مثال: نعمان بن مقرن اور ان کے بھائی: سنان، سوید، عبدالرحمٰن، عقیل اور معقل ___ ساتویں کا نام ذکر نہیں کیا ___ انھوں نے ہجرت کی، نبی ﷺ کی مصاحبت اختیار کی اور کہا جاتا ہے کہ وہ سارے غزوۂ خندق میں موجود تھے۔

ابن عبدالبر وغیرہ نے کہا: اس فضیلت میں اُن کا کوئی شریک نہیں ہے۔ [3]

میں (ابن کثیر) نے کہا: دوسرے سات صحابہ بھی ہیں جو سب کے سب غزوۂ بدر میں شریک تھے لیکن وہ ماں: عفراء بنت عبید کی طرف سے بھائی ہیں۔ عفراء نے پہلے حارث بن رفاعہ الانصاری سے شادی کی تو ان کے دو بیٹے معاذ اور معوذ پیدا ہوئے۔ پھر طلاق کے بعد انھوں نے بکیر بن عبد یالیل بن ناشب سے شادی کی تو ان کے چار بیٹے ہوئے: ایاس، خالد،

---

(۱) شیخ ابو الحسن علی بن حسن بن علی بن عبدالحمید الحلبی الاثری نے کہا: ابن المدینی نے کریمہ کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ دیکھئے تسمیۃ من روی عنہ من اولاد العشرۃ (ص ۱۰۴) اور اختصار علوم الحدیث بتحقیق الحلبی (ج ۲ ص ۵۴۱)

(۲) دیکھئے المحدث الفاصل بین الراوی والواعی (ص ۶۲۴ ح ۹۰۴)

اس کی سند ہشام بن حسان کے عن کی وجہ سے ضعیف ہے اور باقی سند حسن ہے۔

(۳) ابن الملقن نے بتایا کہ ساتویں بھائی کا نام نعیم بن مقرن ہے۔ دیکھئے المقنع (۵۲۸/۲)

عاقل اور عامر پھر (طلاق کے بعد) وہ حارث کے پاس (دوبارہ نکاح کر کے) لوٹ آئیں تو اُن سے عوف پیدا ہوئے۔ ان میں چار بکیر کی طرف سے سگے بھائی ہیں اور تین حارث کی طرف سے سگے بھائی ہیں۔ یہ ساتوں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر میں شریک تھے۔

عفراء کے دونوں بیٹوں معاذ اور معوذ نے ابوجہل عمرو بن ہشام المخزومی کو زخمی کر کے گرایا تھا۔ پھر گرے ہوئے ابوجہل کا سر (سیدنا) عبداللہ بن مسعود الہذلی (رضی اللہ عنہ) نے کاٹا تھا۔ اللہ ان سب سے راضی ہو۔

(۴۴) چوالیسویں قسم: والدین کی اولاد سے روایت کی پہچان

اس کے بارے میں خطیب بغدادی نے ایک کتاب (روایۃ الآباء عن الابناء) لکھی ہے۔

شیخ ابوالفرج ابن الجوزی نے اپنی بعض کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ ابوبکر الصدیق نے اپنی بیٹی عائشہ سے اور ام رومان نے بھی اپنی بیٹی عائشہ سے روایت بیان کی ہے۔ [1]

عباس نے اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور فضل سے روایت بیان کی ہے۔

سلیمان بن طرخان التیمی نے اپنے بیٹے معتمر بن سلیمان سے اور ابوداود نے اپنے بیٹے ابوبکر بن ابی داود سے روایت بیان کی ہے۔ (دیکھئے تلقیح فہوم اہل الاثر لابن الجوزی ص ۷۰۴)

شیخ ابوعمرو ابن الصلاح نے کہا: سفیان بن عیینہ نے وائل بن داود سے انھوں نے اپنے بیٹے بکر بن وائل سے انھوں نے زہری سے انھوں نے سعید بن المسیب سے انھوں نے ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أخروا الأحمال فإن الیہ مغلقة والرجل موثقة)) جانوروں پر کم وزن لادو کیونکہ (ان کے) ہاتھ بند اور پاؤں بندھے ہوتے ہیں۔ [2]

---

(۱) دیکھئے تلقیح فہوم اہل الاثر (ص ۷۰۴) (۲) دیکھئے الفوائد المنتقاۃ للمخلص (۱۱۸، ۱۸۸، بحوالہ حاشیۃ المقنع فی علوم الحدیث ۲/۵۳۵) تنبیہ: اس روایت کی سند امام زہری تک مشکوک ہے (دیکھئے عبداللہ بن یوسف الجدیع کا نفیس کلام/ حاشیۃ المقنع ۲/۵۳۵۔ ۵۳۷) اور اگر صحیح ثابت بھی ہو تو زہری کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

خطیب نے کہا: یہ روایت اسی سند سے معروف ہے۔

کہا: ابو عمر حفص بن عمر الدوری المقریٔ نے اپنے بیٹے ابو جعفر محمد سے سولہ (۱۶) یا ان کے قریب حدیثیں بیان کی ہیں اور (ہمارے علم کے مطابق) والد کی بیٹے سے یہ سب سے زیادہ روایتیں ہیں۔

پھر شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے ابو المظفر عبدالرحیم بن حافظ ابی سعد (السمعانی) سے انھوں نے اپنے ابا سے انھوں نے اپنے بیٹے ابو المظفر سے انھوں نے اپنی سند کے ساتھ ابو امامہ (رضی اللہ عنہ) سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ''اپنے دستر خوانوں پر سبزی لاؤ کیونکہ بسم اللہ پڑھنے سے یہ شیطان کو بھگا دیتی ہیں۔''

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے اس پر سکوت کیا ہے اور ابو الفرج ابن الجوزی نے اسے کتاب الموضوعات (۲/۲۹۸) میں ذکر کیا ہے اور یہ روایت اسی کے لائق ہے کہ موضوع ہو۔[1]

پھر ابن الصلاح نے کہا: ہمیں جو حدیث "أبو بكر الصديق عن عائشة عن رسول الله ﷺ" کی سند سے پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا:

((کالے دانے (کلونجی/شونیز) میں ہر مرض کی شفا ہے)) یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اسے ابو بکر عبداللہ بن ابی عتیق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے بیان کیا ہے۔

(دیکھئے صحیح بخاری: ۵۳۶۳)

انھوں (ابن الصلاح) نے کہا: ہمیں باپ بیٹے پوتے کے لحاظ سے ان کے علاوہ مسلسل چار صحابی معلوم نہیں ہیں: محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہم۔

اور اسی طرح ابن الجوزی وغیرہ ائمہ نے کہا ہے یعنی (۱) ابو قحافہ (۲) ابو بکر صدیق (۳) عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور (۴) محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر چاروں: بیٹا، باپ،

....

(۱) اس کا راوی علاء بن مسلمہ الرؤاس موضوع روایتیں بیان کرتا تھا، اس سے کسی حال میں بھی حجت پکڑنا حلال نہیں ہے۔ دیکھئے کتاب المجروحین لابن حبان (۲/۱۸۶) اسے علامہ عراقی نے بھی موضوع کہا ہے۔

دادا اور پردادا سب صحابی تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین

میں (ابن کثیر) کہتا ہوں کہ ان کے ساتھ عبداللہ بن الزبیر کو بھی شامل کرنا چاہئے کیونکہ ان کی ماں اسماء (رضی اللہ عنہا) ہیں جو ابو بکر الصدیق بن ابی قحافہ کی بیٹی ہیں۔ صحابہ میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی بہ نسبت عبداللہ بن الزبیر زیادہ عمر والے اور مشہور ہیں۔ واللہ اعلم

ابن الجوزی نے کہا: حمزہ اور عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے بھتیجے (سیدنا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے۔[1] (تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۷۰۶)

مصعب الزبیری نے اپنے بھتیجے زبیر بن بکار سے روایت کی ہے۔

اسحاق بن حنبل نے اپنے بھتیجے احمد بن محمد بن حنبل سے روایت بیان کی ہے۔

(امام) مالک نے اپنے بھانجے اسماعیل بن عبداللہ بن ابی اویس سے روایت بیان کی ہے۔

(۴۵) پینتالیسویں قسم: بیٹوں کی والدین سے روایت

یہ بہت زیادہ ہے یعنی اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

رہی بیٹے کی اپنے باپ سے اس کی دادا سے روایت تو یہ بھی زیادہ ہے مگر پہلی قسم سے کم ہے، جیسے "**عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللّٰہ بن عمرو عن أبیه شعیب عن جده عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص**" والی سند (یاد رہے کہ اس سند کی تشریح) یہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ دوسری کوئی بات صحیح نہیں ہے۔

ہم نے اپنی کتاب "**التکمیل**" اور "**الاحکام الکبیر**" اور "**الاحکام الصغیر**" میں کئی مقامات پر اس کے بارے میں کلام کیا ہے۔[2]

---

(۱) حافظ بلقینی نے محاسن الاصطلاح شرح مقدمۃ ابن الصلاح میں کہا: اور اس مثال میں نظر ہے۔ (ص ۴۷۹)

(۲) حافظ ابن کثیر کا مطلب یہ ہے کہ شعیب اپنے دادا عبداللہ سے روایت بیان کرتے ہیں، اپنے والد محمد سے بیان نہیں کرتے۔

"بهز بن حكيم بن معاويه بن حيدة القشيري عن أبيه عن جده معاوية" کی سنداور مثلاً "طلحة بن مصرف عن أبيه عن جده" کی سند، جدّ سے مراد عمرو بن کعب ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کعب بن عمرو ہیں۔

ان اقسام کو اکٹھا کرنا باعثِ طوالت ہے۔

حافظ ابونصر الوائلی نے اس کے بارے میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے اور بعض متاخرین نے ان پر بعض اہم (اور) اچھی چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

بعض اسانید میں "فلان عن أبيه عن أبيه عن أبيه" اور اس سے زیادہ بھی آیا ہے۔[مثلاً دیکھئے حافظ ابن عساکر کی کتاب "ذم من لايعمل بعلمه" (ح ۵)]

مگر ان میں سے بہت کم صحیح ہیں۔ واللہ اعلم

(۴۶) چھیالیسویں قسم: السابق واللاحق کی روایت کی پہچان

اس میں خطیب (بغدادی) نے ایک خاص کتاب لکھی ہے۔

یہ اس وقت ہوتا ہے جب اصاغر سے اکابر روایت کریں پھر جس سے روایت کی گئی ہے اُس سے کوئی متاخر روایت بیان کرے۔

جس طرح کہ زہری نے اپنے شاگرد مالک بن انس سے روایت بیان کی اور زہری ایک سو چوبیس (۱۲۴ھ) میں فوت ہوگئے۔

مالک سے زکریا بن دُوَید الکندی نے روایت بیان کی اور وہ زہری کی وفات کے ایک سو سینتیس سال (۱۳۷ھ) یا بعد میں مرا جیسا کہ ابن الصلاح نے کہا ہے۔[1]

---

(۱) زکریا بن دوید تو کذاب تھا جیسا کہ لسان المیزان میں ہے۔ احمد بن اسماعیل السہمی امام مالک کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے امام مالک سے موطأ کی روایت کی۔ وہ ۲۵۹ھ میں فوت ہوئے لہٰذا اُن کے اور زہری کے درمیان ۱۳۵ سال کا فاصلہ ہے۔

اسی طرح (امام) بخاری نے محمد بن اسحاق السراج سے روایت بیان کی۔ سراج سے ابوالحسین احمد بن محمد الخفاف النیسابوری نے بھی روایت کی۔ بخاری ۲۵۶ھ میں فوت ہوئے اور الخفاف ۳۹۴ھ یا ۳۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ اس لحاظ سے بخاری اور خفاف کی وفات کے درمیان ایک سو سینتیس (۱۳۷) سال کا فاصلہ ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ہمارے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج المزی نے اپنی کتاب ''تہذیب الکمال'' میں اس کا بہت خیال رکھا ہے۔

بہت سے محدّثین اس کے بہت زیادہ درپے رہتے ہیں (لیکن) یہ اہم فنون میں سے نہیں ہے۔

(۴۷) سینتالیسویں قسم: اس کی پہچان جس سے صرف ایک راوی نے روایت بیان کی ہے، چاہے صحابی ہو یا تابعی وغیرہ

مسلم بن الحجاج نے اس میں ایک کتاب (الوحدان) لکھی ہے۔

عامر الشعبی نے صحابہ کی ایک جماعت سے (روایت میں) تفرد کیا ہے۔ مثلاً:

عامر بن شہر، عروہ بن مُضَرِّس، محمد بن صفوان الانصاری اور محمد بن صَیفی الانصاری،

کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ دو (علیحدہ علیحدہ) ہیں۔

وہب بن خَنْبَش، انھیں ہَرِم بن خنبش بھی کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

سعید بن المسیّب بن حزن نے اپنے والد سے روایت میں تفرد کیا ہے۔

اسی طرح شُتیر بن شَکَل بن حمید نے اپنے والد سے اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے اپنے والد سے تفرد کیا ہے۔

قیس بن ابی حازم نے اپنے والد اور دُکین بن سعید المزنی، صنابح بن الاعسر اور مرداس بن مالک الاسلمی سے (روایت میں) تفرد کیا ہے اور یہ سب صحابہ ہیں۔

ابن الصلاح نے کہا: حاکم نے (المدخل الی) الاکلیل میں دعویٰ کیا ہے کہ بخاری و مسلم

نے اس قسم کے راویوں سے اپنی صحیحین میں کوئی روایت نہیں لی۔ (دیکھئے المدخل ص ۱۰،۹)

انھوں نے کہا: اس کا اُن (حاکم) پر انکار کیا گیا ہے۔ ان کی بات اس سے بھی منقوض ہے کہ بخاری و مسلم نے وفاتِ ابی طالب کے بارے میں سعید بن المسیب عن ابیہ کی سند سے روایت بیان کی ہے حالانکہ مسیّب سے سعید کے علاوہ کسی دوسرے نے روایت بیان نہیں کی۔ (۱)

بخاری نے قیس بن ابی حازم کی سند سے مرداس الاسلمی سے "یذهب الصالحون: الأول فالأول..." والی حدیث بیان کی ہے۔ (ح ۶۰۷۰)

(اور بخاری نے) حسن عن عمرو بن تغلب سے "إني لأعطي الرجلَ وغيره أحبّ إليّ منه" والی حدیث بیان کی ہے حالانکہ عمرو بن تغلب سے حسن (بصری) کے علاوہ کسی نے روایت بیان نہیں کی۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ۷۵۳۵،۳۱۴۵،۹۲۳)

مسلم نے الاغر المزنی کی (بیان کردہ) حدیث ((إنه ليغان على قلبي)) بیان کی ہے اوران سے ابو بردہ کے علاوہ کسی نے روایت بیان نہیں کی۔! (دیکھئے صحیح مسلم: ۲۷۰۲)

(مسلم نے) رفاعہ بن عمرو کی حدیث بیان کی ہے حالانکہ ان سے عبداللہ بن الصامت کے سوا کسی نے روایت بیان نہیں کی۔! (دیکھئے صحیح مسلم: ۱۰۶۷، وفیہ: "رافع بن عمرو" وھوالصواب)

(اور مسلم نے) ابورفاعہ سے روایت لی ہے اور اُن سے حمید بن ہلال العَدَوی کے کسی نے حدیث بیان نہیں کی۔! (دیکھئے صحیح مسلم: ۸۷۶)

اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں۔

پھر ابن الصلاح نے کہا: بخاری و مسلم کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک ایک کی روایت سے بھی راوی کی جہالت ختم ہو جاتی ہے (بشرطیکہ اس کی توثیق ثابت ہو۔)

میں (ابن کثیر) نے کہا: رہی ثقہ کی استاد سے روایت تو کیا یہ توثیق ہے یا نہیں؟

(۱) دیکھئے صحیح بخاری (۱۳۶۰، ۳۸۸۴، ۴۶۷۵، ۴۷۷۲، ۶۶۸۱) اور صحیح مسلم (۲۴)

اس میں اختلاف مشہور ہے...... تیسرا قول یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے استادوں کی توثیق کی شرط لگائی ہے جیسے (امام) مالک وغیرہ تو یہ (ان کے نزدیک) توثیق ہے ورنہ نہیں ہے۔(۱)

اگر ہم اسے توثیق نہ بھی مانیں تو صحابی کی جہالت مضر نہیں ہے کیونکہ وہ دوسروں کے برخلاف سب کے سب ثقہ ہیں۔

پس شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) رحمہ اللہ کا استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اُن کے ذکر کردہ تمام صحابہ ہیں۔ واللہ اعلم

رہے تابعین تو حماد بن سلمہ نے ابو العُشَرَاء الدارمی عن ابیہ کی سند سے وہ حدیث بیان کی ہے کہ (پوچھا گیا:) کیا ذبح سینے اور گردن کے درمیان گلے (لَبہ) پر نہیں ہوتا؟

تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: اگر تُو اُس کی ران پر بھی زخم لگائے تو تیرے لئے جائز و کافی ہے۔ ابو العشراء سے حماد بن سلمہ کے سوا کسی نے روایت بیان نہیں کی ہے۔(۲)

کہا جاتا ہے کہ زہری نے بیس سے اوپر تابعین سے (روایت میں) تفرد کیا ہے، اسی طرح عمرو بن دینار، ہشام بن عروہ، ابو اسحاق السَّبیعی اور یحییٰ بن سعید الانصاری نے تابعین کی ایک جماعت سے روایت بیان کرنے میں تفرد کیا ہے۔

حاکم نے کہا: مالک نے مدینے کے تقریباً دس شیوخ سے تفرد کیا ہے جن سے اُن کے

....

(۱) جو علماء اپنے نزدیک صرف ثقہ سے روایت کرتے تھے، اُس میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:

شعبہ، مالک، یحییٰ القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، احمد بن حنبل، بقی بن مخلد، سلیمان بن حرب، یحییٰ بن ابی کثیر، ابوداود، علی بن المدینی، ابوزرعہ الرازی، عبداللہ بن احمد بن حنبل، موسیٰ بن ہارون الحمال، زائدہ بن قدامہ، منصور بن المعتمر اور یعقوب بن سفیان الفارسی وغیرہم۔

دیکھئے میری کتاب: تخریج النہایہ فی الفتن والملاحم (قلمی ص ۳۸۹، ۳۹۰ ح ۱۲۶۹)

(۲) اس روایت کے لئے دیکھئے سنن ابی داود (۲۸۲۵) سنن الترمذی (۱۴۸۱) سنن النسائی (۴۴۱۳) سنن ابن ماجہ (۳۱۸۴) اور منتقیٰ ابن الجارود (۹۰۱) اس کی سند ضعیف ہے۔

علاوہ کسی دوسرے نے روایت بیان نہیں کی۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۶۰)

۴۸۔ اڑتالیسویں قسم: جس کے کئی نام ہوں، اُس کی معرفت

بعض لوگ (ان ناموں کی وجہ سے) یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کئی آدمی ہیں یا ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے یا کنیت بیان کی جاتی ہے تو جسے معلوم نہیں ہوتا وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دوسرا شخص ہے۔ عام طور پر مدلّسین سے ایسی چیزیں صادر ہوتی ہیں، وہ ان کے ساتھ لوگوں کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔ وہ آدمی کا ایسا نام ذکر کر دیتے ہیں جس کے ساتھ وہ مشہور نہیں ہوتا یا اسے ایسی کنیت سے یاد کرتے ہیں جو اس پر مبہم (اور مجہول) بن جاتا ہے جس کے پاس اس کی معرفت نہیں ہوتی اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

حافظ عبدالغنی بن سعید المصری نے اس کے بارے میں ایک کتاب (ایضاح الاشکال) لکھی ہے۔ لوگوں نے کنیتوں پر کتابیں لکھی ہیں جن میں ایسے لوگوں کا حل پایا جاتا ہے جنھیں اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی مثالوں میں سے محمد بن السائب الکلبی ہے جو کہ ضعیف ہے لیکن وہ تفسیر و تاریخ کا عالم تھا۔[۱]

بعض اس کے نام کی صراحت کر دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں: حماد بن السائب

(دیکھئے المستدرک ۲۴/۴ و موضح اوھام الجمع والتفریق ۳۵۷/۲۔۳۵۹)

بعض اس کی ابو النضر کنیت رکھتے تھے۔ (دیکھئے سنن الترمذی: ۳۰۶۱)

اور بعض اسے ابو سعید کی کنیت سے یاد کرتے تھے۔

ابن الصلاح نے کہا: یہ وہی ہے جس سے عطیہ العوفی تفسیر بیان کرتا ہے اور دھوکا یہ دیتا ہے وہ ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ (دیکھئے الکامل لابن عدی ۲۱۲۷/۶ والمجروحین لابن حبان ۲۵۳/۲)

---

(۱) تفسیر ہو یا تاریخ راجح یہی ہے کہ محمد بن السائب الکلبی کذاب وضاع تھا لہٰذا اُس کی روایت کا وجود اور عدم وجود ایک برابر ہے۔

اسی طرح سالم ابو عبداللہ المدنی سَبَلان (لقب) کے ساتھ مشہور ہے۔ یہ (سیدنا) ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت بیان کرتا ہے۔ راوی اس کا رشتۂ ولایت مختلف اطراف سے جوڑتے ہیں۔ اس کی بھی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔ تدلیس کی بہت زیادہ اقسام ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

(۴۹) انچاسویں قسم: ایسے اسمائے مفردہ اور کنیتوں کی معرفت جو ہر حرف میں اس کے سوا کسی اور میں نہیں پائے جاتے

اس کے بارے میں حافظ احمد بن ہارون البردیجی وغیرہ نے کتابیں لکھی ہیں۔

ایسی بہت سی باتیں (عبدالرحمٰن) ابن ابی حاتم (الرازی) کی کتاب ''الجرح والتعدیل'' وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔ ابو نصر ابن ماکولا کی ''الاکمال'' میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔

شیخ ابو عمرو ابن الصلاح نے بہت سے مفرد اسماء (نام) ذکر کئے ہیں،

اجمد ...... جیم کے ساتھ ...... ابن عُجَیَّان ...... عُلَیَّان کے وزن پر،

ابن الصلاح نے کہا: میں نے ابن الفرات کے (لکھے ہوئے) خط سے اسے ''سفیان'' کے وزن پر بغیر تشدید کے پایا ہے۔ اسے ابن یونس (المصری) نے صحابہ میں ذکر کیا ہے۔

أوسط بن عمرو البَجلی تابعی ہیں۔

تَدُوم بن صُبیح (✓) الكلاعی تُبَیع الحِمیَری ابن امرأة كعب الاحبار (سے راوی ہیں)

جُبَیب ...... جیم کے ساتھ ...... ابن الحارث صحابی ہیں۔

جیلان بن (أبي) فروہ، أبو الجلد الاخباری تابعی ہیں۔

وُجَین بن ثابت ابو الغُصن، کہا جاتا ہے کہ وہ جُحَا ہیں۔ (ایک شخص جس کی طرف مزاحیہ قصے کہانیاں منسوب کی جاتی ہیں) ابن الصلاح نے کہا: صحیح یہ ہے کہ وہ جُحَا نہیں ہے۔

زِر بن حُبَیش

سُعَیُر بن الخِمْس

سَندر الخَصِی ، مولیٰ زِنباع الجُذامی صحابی ہیں۔

شَکَل بن حُمَید صحابی ہیں۔

شُمُغُون...... شین اور غین کے ساتھ...... بن زید، ابو ریحانہ صحابی ہیں۔ بعض عین سے کہتے ہیں۔ (شمعون) صُدَیّ بن عَجلان ابو اُمامہ صحابی ہیں۔

صنابح بن الاَعسر

ضُرَیب بن نُقَیر، ابو السَّلیل القَیسی البصری، معاذہ (تابعیہ) سے روایت کرتے ہیں۔

عَزوان...... عین سے...... بن زید الرَّقاشی عبادت گزار تابعیوں میں سے ہیں۔

کَلَدہ بن حَنبل صحابی ہیں۔

لُبَی بن لَبا صحابی ہیں۔

لِمازہ بن زَبّار

مُستَمِر بن الرَّیّان نے انس (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا۔

نُبَیشَۃ الخیر صحابی ہیں۔

نَوف البِکالی تابعی ہیں۔

وابصہ بن مَعبَد صحابی ہیں۔

هُبَیب بن مُغفِل

هَمدان...... دال مہملہ یا ذال معجمہ کے ساتھ...... عمر بن الخطاب کی ڈاک لے جانے والے تھے۔

ابن الجوزی نے اپنی بعض کتابوں میں کہا:

مسئلہ: کیا تم محدثین میں سے ایسا آدمی جانتے ہو جس کے باپ دادا میں سے کسی کا نام بھی (دوسرے لوگوں میں) نہ پایا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مُسَدَّد بن مُسَرهَد بن مُسَربَل بن مُغَربَل بن

مُطَربَل بن اَرنُدَل بن عَرَندَل بن ماسَک الاسدی ہیں۔[1]

ابن الصلاح نے کہا: مفرد کنیتوں میں سے (چند یہ ہیں۔)

ابوالعُبَیدین: ان کا نام معاویہ بن سَبرہ ہے وہ ابن مسعود کے شاگردوں میں سے تھے۔

ابوالعُشَراء الدارمی کا ذکر گزر چکا ہے۔

ابوالمُدِلّہ کا نام معروف نہیں ہے، وہ اعمش کے استادوں میں سے تھے۔[2]

ابونعیم الاصبہانی نے دعویٰ کیا کہ ان (ابوالمُدِلّہ) کا نام عبیداللہ بن عبداللہ المدنی ہے۔

ابومُرایہ العِجلی عبداللہ بن عمرو تابعی ہیں۔

ابومُعَید حفص بن غیلان الدمشقی مکحول کے شاگرد تھے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ان سے دس کے قریب راویوں نے روایت بیان کی ہے، اس کے باوجود ابن حزم نے کہا: وہ مجہول ہے۔ (دیکھئے المحلی ۳۷/۷) اس لئے کہ انھیں ان کا حال اور ان کے شاگرد کا ذکر معلوم نہیں ہو سکا تو انھوں نے علم کے بغیر ہی اُن پر مجہول کا حکم لگا دیا جس طرح انھوں نے سنن ترمذی کے مصنف (امام) ترمذی کو یہ کہتے ہوئے مجہول سمجھا کہ ''محمد بن عیسیٰ بن سورہ کون ہے؟''

مفرد کنیتوں میں سے ابوالسَّنابل لُبید ربہ بن بَعکک بنو عبدالدار والے ایک صحابی ہیں، ان کا نام، ان کے والد کا نام اور ان کی کنیت (سب) افراد میں سے ہیں۔

ابن الصلاح نے کہا: مفرد القاب میں سے سفینہ صحابی کی مثال ہے، اُن کا نام مہران یا کچھ اور ہے۔

مَندَل بن علی العَنزی کا نام عمرو ہے۔

---

(۱) (دیکھئے تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۲۰۷) اس میں صرف مسربل تک سلسلہ ثابت ہے۔ باقی ناموں کا راوی منصور الخالدی مجروح ہے۔

(۲) ابوالمُدِلّہ اعمش کے استادوں میں سے نہیں بلکہ ابومجاہد الطائی کے استادوں میں سے تھے۔

سَحنون بن سعید کا نام عبدالسلام ہے۔ مُدَوَّنہ ان کی کتاب ہے۔ [1]

مُطَيَّن [محمد بن عبداللہ الحضرمی الحافظ مشہور ہیں۔]

مُشْکُدانه الجعفی [عبداللہ بن عمر بن ابان الاموی کا لقب ہے۔]

اس طرح کے اور بہت سے لوگ ہیں جنھیں ہم ان شاءاللہ تعالیٰ القاب میں ذکر کریں گے۔

(۵۰) پچاسویں قسم: اسماء و کُنیٰ کی معرفت

اس کے بارے میں حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے کتابیں لکھی ہیں جن میں علی بن المدینی، مسلم، نسائی، دولابی، ابن مندہ اور ابواحمد الحاکم الحافظ ہیں۔ حاکم (کبیر) کی یہ کتاب بہت زیادہ مفید ہے۔ [۲]

ان کا طریقہ یہ ہے کہ کنیت بیان کر کے کنیت والے کا نام بتا دیتے ہیں۔ بعض کا نام معلوم نہیں ہوتا اور بعض کے نام میں اختلاف ہوتا ہے۔

ابن الصلاح نے ان کی کئی اقسام لکھی ہیں:

اول: جس کا کنیت کے سوا کوئی نام نہ ہو مثلاً ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام المخزومی المدنی، فقہاء سبعہ میں سے ایک، آپ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن بھی ہے۔

اسی طرح ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم المدنی ہیں اُن کی کنیت ابو محمد بھی ہے۔

خطیب نے کہا: ان دونوں کی کوئی مثال نہیں ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس ابن حزم کی (ابو بکر کے علاوہ دوسری) کوئی کنیت نہیں ہے۔

---

(۱) مالکیوں کی کتاب مُدَوَّنہ بے سند اور غیر معتبر کتاب ہے۔ بعض علماء نے اس کتاب کا خاص طور پر رد لکھا ہے۔ وہ اسے مدوّدہ (کیڑوں والی کتاب) کہتے تھے۔ دیکھئے میری کتاب القول المتین (ص ۸۷)

(۲) حاکم دو ہیں: ایک ابو عبداللہ الحاکم، یہ مستدرک اور معرفۃ علوم الحدیث والے ہیں۔ دوسرے ابواحمد الحاکم الکبیر یہ کُنٰی والے ہیں۔

جس کا کنیت کے علاوہ کوئی نام نہ ہو، اُن میں شریک (بن عبداللہ القاضی) وغیرہ کا شاگرد ابو بلال الاشعری ہے۔ وہ کہتا تھا: میری کنیت ہی میرا نام ہے۔[1]

اور ابو حَصِین ابن یحییٰ بن سلیمان الرازی، ابو حاتم (الرازی) وغیرہ کے استاد ہیں۔ (ان کا نام بھی یہی کنیت ہے۔)

قسم دوم: جو شخص اپنی کنیت کے علاوہ مشہور نہ ہو، اس کا نام معلوم نہ ہو۔ مثلاً:

ابو اُناس ــ نون کے ساتھ ــ صحابی ہیں۔

ابو مُـهَـيْـبَه صحابی ہیں۔

ابو شَیبہ الخُدری جو حصارِ قسطنطینیہ میں قتل ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ

ابو الابیض نے انس (بن مالک رضی اللہ عنہ) سے روایت کی ہے۔

ابو بکر بن نافع مالک (بن انس الامام) کے اُستاد ہیں۔

ابو النَّجیب ــ نون مفتوحہ کے ساتھ ــ بعض کہتے ہیں کہ پیش (ضمہ) والی تاء مثناۃ کے ساتھ، وہ عبداللہ بن عمرو (بن العاص) کے مولیٰ ہیں۔[2]

ابو حرب بن ابی الاسود

ابو حَریز الموقفی ابن وہب کے استاذ ہیں۔ موقف مصر کا ایک محلّہ ہے۔

سوم: جس کی دو کنیتیں ہوں، جن میں ایک لقب ہو۔ مثلاً:

علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) ان کی کنیت ابو الحسن ہے اور انھیں بطورِ لقب ابو تُراب کہا جاتا ہے۔

ابو الزِّناد عبداللہ بن ذکوان کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے اور ان کا لقب ابو الزِّناد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس لقب پر غصہ کرتے تھے۔

ابو الرِّجال محمد بن عبدالرحمٰن کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے اور ابو الرجال ان کا لقب ہے

(۱) کتاب الجرح والتعدیل (۳۵۰/۹ ت ۱۵۶۶)

(۲) عراقی نے کہا کہ وہ عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح کے مولیٰ ہیں۔

کیونکہ ان کے دس بیٹے تھے۔ (۱)

ابوتُمیلہ یحییٰ بن واضح ، ان کی کنیت ابومحمد ہے۔

ابوالآذان حافظ عمر بن ابراہیم کی کنیت ابوبکر اور لقب لمبے کانوں کی وجہ سے ابوالآذان ہے۔

ابوالشیخ الاصبہانی الحافظ عبداللہ (بن محمد بن جعفر) کی کنیت ابومحمد اور لقب ابوالشیخ ہے۔

ابوحازم العَبْدَوی الحافظ عمر بن احمد کی کنیت ابوحفص اور لقب ابوحازم ہے۔ یہ بات (علی بن الحسین بن احمد) الفلکی (متوفی ۴۲۷ھ) نے (اپنی کتاب) "الالقاب" میں بیان فرمائی ہے۔

چہارم: جس کی دو کنیتیں ہوں جیسے ابن جریج انھیں ابوخالد اور ابوالولید کہا جاتا ہے۔ عبداللہ (بن عمر) العمری کو ابوالقاسم کی کنیت سے پکارا جاتا تھا پھر انھوں نے اسے ترک کر کے ابوعبدالرحمٰن کنیت رکھ لی۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: سُہَیلی (عبدالرحمٰن بن عبداللہ الخثعمی) کی دو کنیتیں تھیں ابوالقاسم اور ابوعبدالرحمٰن۔

ابن الصلاح نے کہا: ہمارے شیخ منصور بن ابی المعالی النیسابوری کی تین کنیتیں تھیں: ابوبکر، ابوالفتح اور ابوالقاسم، واللہ اعلم۔ آپ الفراوی کے پوتے تھے۔ (۲)

پنجم: جس کا نام مشہور ہو لیکن کنیت میں اختلاف ہو۔ ان کی دو یا زیادہ کنیتیں اکٹھی ہوگئی ہوں مثلاً: رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ زید بن حارثہ کی کنیت میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوخارجہ یا ابوزید یا ابوعبداللہ یا ابومحمد۔

اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جنھیں جمع کرنا باعثِ طوالت ہے۔

---

(۱) ہمارے استاذ شیخ حافظ ابوالرجال اللہ دتہ کرم الٰہی بن احمد دین السوہدروی رحمہ اللہ کی کنیت ابوفہد اور لقب ابوالرجال ہے۔ آپ کے دس بیٹے تھے۔ دیکھئے میری کتاب علمی مقالات (ج ۱ ص ۵۲۰)

(۲) دیکھئے کتاب: التقیید لابن نقطہ (۲/ ۲۶۲)

چھٹی قسم: جس کی کنیت مشہور ہو اور نام میں اختلاف ہو جیسے (سیدنا) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کے نام اور والد کے نام میں بیس سے زیادہ اقوال پر اختلاف ہے۔

ابن اسحاق (امام المغازی) نے کہا: ''وہ عبدالرحمٰن بن صخر ہیں'' اور اسے ابو احمد الحاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ صحابہ اور بعد والوں میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابوبکر بن عیاش کے نام میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں گیارہ اقوال ہیں۔

ابوزرعہ اور ابن عبدالبر نے اسے راجح قرار دے کر کہا: کیونکہ ان (ابن عیاش) سے مروی ہے کہ وہ یہ بات کہتے تھے (کہ میرا نام میری کنیت ہے۔)[1]

ہفتم: جس کے نام اور کنیت میں اختلاف ہو۔ اس کی مثالیں تھوڑی ہیں مثلاً:

سفینہ (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کا نام مہران ہے یا عُمیر یا صالح ہے۔

اور ان کی کنیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن یا ابو البَختَری ہے۔

ہشتم: جو اپنے نام اور کنیت (دونوں) کے ساتھ مشہور ہو مثلاً ائمہ اربعہ (ان میں ائمہ ثلاثہ) ابوعبداللہ مالک، (ابوعبداللہ) الشافعی اور (ابوعبداللہ) احمد بن حنبل ہیں۔

اور (چوتھے امام) ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔

نہم: جو اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت سے مشہور ہو حالانکہ اس کا نام متعین اور معلوم تھا مثلاً:

ابو اِدریس الخَولانی: عائذ اللہ بن عبداللہ

ابومسلم الخَولانی: عبداللہ بن ثُوَب

ابواسحاق السَّبِیعی: عمرو بن عبداللہ

ابو الضُّحیٰ: مسلم بن صُبَیح

ابوالاشعث الصنعانی: شَرَاحیل بن آدة

(۱) ابوبکر بن عیاش کا یہ قول تاریخ بغداد (۳۷۷/۱۴) میں مختلف سندوں کے ساتھ ہے۔

نیز دیکھئے کتاب المعرفۃ والتاریخ (۱۸۳/۱) بلفظ: ''ھو اسمی'' وسندہ صحیح.

ابوحازم: سلمہ بن دینار، اسی طرح کی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔

(۵۱) اکاونویں قسم: اس کی پہچان جو شخص اپنی کنیت کے بغیر اپنے نام سے مشہور ہو

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے صحابہ کرام کی ایک جماعت ذکر کی ہے جن کی کنیت ابومحمد ہے۔ مثلاً اشعث بن قیس، ثابت بن قیس، جبیر بن مُطعِم، حسن بن علی، حُویطِب بن عبدالعزّٰی، طلحہ بن عبیداللہ، عبداللہ ابن بُحَینہ، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن ثعلبہ بن صُعَیر، عبداللہ بن زید صاحب الأذان، عبداللہ بن عمرو (بن العاص)، عبدالرحمٰن بن عوف، کعب بن مالک اور معقل بن سنان۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

انھوں نے ابوعبداللہ اور ابوعبدالرحمٰن کی کنیتوں والوں کا ذکر بھی کیا۔ اگر ہم ان سب کو اکٹھا کرتے تو یہ فصل بہت لمبی ہو جاتی۔

مناسب یہ تھا کہ اس نوع (قسم) کو سابقہ قسم کی اقسام میں سے دسویں قسم بنایا جاتا۔

(۵۲) باونویں قسم: معرفتِ القاب

اس کے بارے میں بھی کئی علماء نے کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ابوبکر احمد بن عبدالرحمٰن الشیرازی کی کتاب (الالقاب) بہت مفید اور کثیر نفع والی ہے، پھر ابوالفضل ابن الفلکی الحافظ کی کتاب ہے۔ اس پر تنبیہ کا فائدہ یہ ہے کہ اس لقب کو کسی دوسرے شخص کے بارے میں نہ سمجھ لیا جائے۔ اگر کسی شخص کے نزدیک ناپسندیدہ لقب مشہور کر دیا گیا ہے تو ائمۂ حدیث اسے تمیز اور پہچان کے لئے ذکر کرتے ہیں، مذمت، عیب جوئی اور بُرا لقب رکھنے کے طور پر استعمال نہیں کرتے۔ اللہ ہی صحیح راستے کی توفیق دینے والا ہے۔

حافظ عبدالغنی بن سعید المصری نے کہا: دو اچھے آدمیوں کے ساتھ دو بُرے لقب منسوب

ہو گئے ہیں۔معاویہ بن عبدالکریم الضال (گمراہ) وہ مکہ کے راستے میں گم ہو گئے تھے۔

عبداللہ بن محمد الضعیف ، وہ جسمانی لحاظ سے ضعیف (کمزور) تھے، حدیث میں ضعیف نہیں تھے۔ ابن الصلاح نے کہا: تیسرے عارم (بدخُو آدمی) ابو النعمان محمد بن الفضل السدوسی نیک آدمی تھے۔ بدخوئی سے (بہت) دُور تھے۔ عارم شرید فسادی کو کہتے ہیں۔

غُندَر: شعبہ کے شاگرد محمد بن جعفر البصری کا لقب ہے۔

ابوحاتم الرازی کے شاگرد محمد بن جعفر الرازی بھی غندر کہلاتے تھے۔

حافظ ابونعیم الاصبہانی وغیرہ کے استاد محمد بن جعفر البغدادی الحافظ الجوال کا لقب بھی غندر ہے۔

اور محمد بن جعفر بن دُران البغدادی جو ابوخلیفہ الجمحی سے روایت کرتے تھے، غندر ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی لقب غندر ہے۔

غنجار: عیسیٰ بن موسیٰ التمیمی ابواحمد البخاری کا لقب ہے جنھوں نے مالک اور ثوری وغیرہما سے روایت بیان کی ہے۔ انھیں اس لئے غنجار کہتے تھے کہ ان کے رخسار سُرخ تھے۔

دوسرے غنجار متاخرین میں سے ابوعبداللہ محمد بن احمد البخاری ہیں جنھوں نے تاریخ بخارا لکھی۔ آپ چار سو بارہ (۴۱۲ھ) میں فوت ہوئے۔

صاعقہ: (امام) بخاری کے استاد محمد بن عبدالرحیم کا لقب ہے کیونکہ آپ کا حافظہ (بجلی کی کڑک کی طرح) بہت مضبوط اور یادداشت بہت اچھی تھی۔

شَباب: خلیفہ بن خیاط المورخ ہیں۔

زُنَیج: مسلم کے استاد محمد بن عمرو الرازی ہیں۔

رُستہ: عبدالرحمٰن بن عمرو ہیں۔

سُنَید: حسین بن داود المفسر ہیں۔

بُندار: کتبِ ستہ والوں کے استاد محمد بن بشار کا لقب ہے کیونکہ وہ کثرت سے حدیثیں بیان کرنے والے محدّث تھے۔

قیصر: امام احمد بن حنبل کے استاد ابوالنضر ہاشم بن القاسم کا لقب ہے۔

الاخفش: ایک جماعت کا لقب ہے جن میں احمد بن عمران البصری النحوی ہیں۔ انھوں نے زید بن الحباب سے روایت کی اور ''غریب الموطأ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

ابن الصلاح نے کہا: نحویوں میں تین اخفش مشہور ہیں:

ان میں سب سے بڑے ابوالخطاب عبدالحمید بن عبدالمجید ہیں جنھیں سِیبَویہ اپنی مشہور کتاب میں ذکر کرتے ہیں۔

دوسرے ابوالحسن سعید بن مسعدہ ہیں جو سیبویہ کی کتاب کے راوی ہیں۔

تیسرے ابوالحسن علی بن سلیمان ہیں جو ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب اور ابوالعباس محمد بن یزید المَبرّد کے شاگرد ہیں۔

مربَّع: حافظ محمد بن ابراہیم البغدادی کا لقب ہے۔

جَزَرہ: صالح بن محمد الحافظ البغدادی کا لقب ہے۔

کِیلَجہ: حافظ محمد بن صالح البغدادی کا لقب ہے۔

ماغَمّہ: حافظ علی بن عبدالصمد البغدادی کا لقب ہے۔ انھیں علّانُ ماغمہ بھی کہا جاتا ہے، اس طرح ان کے دو لقب ہیں۔

عُبَیدُ العِجلُ: ابوعبداللہ حسین بن محمد بن حاتم الحافظ البغدادی کا لقب ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: یہ پانچوں بغدادی حفاظِ حدیث ہیں جو یحییٰ بن معین کے شاگرد تھے۔ ان کے یہ القاب یحییٰ بن معین نے رکھے تھے۔

سَجّادہ: وکیع کے شاگردوں میں سے حسن بن حماد کا لقب ہے۔ ابن عدی کے استاد حسین بن احمد کا لقب بھی سجادہ ہے۔

عبدان: ایک جماعت کا لقب ہے جن میں بخاری کے استاد عبداللہ بن عثمان ہیں۔

یہ (وہ) القاب ہیں جنھیں شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے ذکر کیا ہے۔

انھیں اکٹھا کرنا زیادہ طوالت کا باعث ہے۔ واللہ اعلم

(۵۳) ترپنویں قسم: المؤتلف والمختلف اور اس سے مشابہ اَسماء واَنساب کی معرفت

جس کی صورت لکھنے میں ایک جیسی اور پڑھنے میں مختلف ہو۔

ابن الصلاح نے کہا: یہ بہترین فن ہے۔ محدثین میں سے جو اسے نہیں جانتا، اس کی غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ شرمندہ رہتا ہے۔

اس کے بارے میں مفید کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کامل ترین ابن ماکولا کی کتاب ''الاکمال'' ہے، اگر اس میں بعض مقامات پر کمی اور نقص نہ ہوتا۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: حافظ عبدالغنی بن نُقطہ نے ''الاکمال'' کے برابر اس پر (اکمال الاکمال یا الاستدراک کے نام سے) استدراک کیا ہے جس میں بہت زیادہ فائدے ہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابو عبداللہ (محمد بن محمود بن الحسن بن) النجار کی کتاب اس باب میں بہت مفید ہے۔[1]

اس کی مثالوں میں سے (بعض درج ذیل ہیں):

سَلّام اور سَلَام

عُمارہ اور عِمارہ

حِزام: حَرام

عباس: عیاش

غُنّام: عَثّام

(۱) اختصار علوم الحدیث کے قلمی نسخوں میں ''ابو عبداللہ البخاری'' لکھا ہوا ہے جو کہ غلط ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے البدایہ والنہایہ (۱۶۹/۱۳) اور اختصار علوم الحدیث پر شیخ علی بن حسن الحلبی کا حاشیہ (۶۱۹/۲)

بَشَّار: یَسَار

بِشْر: بُسْر

بَشِیر: یُسَیر اور نُسَیر

حارثہ: جاریہ

جریر: حریز

حِبَّان: حَیَّان

رَبَاح: رِبَاح

سُرَیج: شُرَیح

عِبَاد: عُبَاد، وغیرہ

اور جیسے کہا جاتا ہے: العَنْسی ، العَیْشی اور العَبْسی

الحَمَّال: الجَمَّال

الخَیَّاط: الحَنَّاط اور الخَبَّاط

البَزَّار: البزاز

الأُبلّی: الاَیلی

البصری: النصری

الثَّوری: التَّوری

الجُرَیری: الجِرِیری اور الحَرِیری

السَّلَمی: السُّلَمی

الہمدانی: الہمذانی، اس طرح کی بھی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔

یہ چیزیں اپنے مقامات پر بہترین حافظے اور تحقیق سے یاد ہوتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ مدد کرنے والا، آسانی پیدا کرنے والا ہے۔ اسی سے مدد مانگتے ہیں۔

(۵۴) چونویں قسم: اسماء وانساب میں سے متفق ومفترق کی پہچان

اس کے بارے میں خطیب نے ایک بڑی کتاب (المتفق والمفترق) لکھی ہے۔

شیخ ابوعمرو (ابن الصلاح) نے اس کی کئی قسمیں ذکر کی ہیں:

اول: دو یا زیادہ راوی اپنے نام اور والد کے نام میں متفق ہوں مثلاً:

خلیل بن احمد چھ (۶) ہیں۔

ایک نحوی بصری ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے علمِ عروض مرتب کیا۔ بعض نے کہا نبی ﷺ کے بعد خلیل بن احمد کے والد کے سوا کسی کا نام احمد نہیں ہے سوائے ابوالسفر سعید بن احمد کے جیسا کہ ابن معین کا ایک قول ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ان کا نام سعید بن یحمد ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے ابوبشر المزنی بھی بصری ہیں۔ انھوں نے مُستنیر بن اخضر سے انھوں نے معاویہ (بن قُرّہ) سے روایت کی۔ اُن سے عباس العنبری اور ایک جماعت روایت بیان کرتی ہے۔

سوم: اصبہانی ہیں جو رَوح بن عُبادہ وغیرہ سے روایت بیان کرتے ہیں۔

چہارم: ابوسعید السجزی خراسان کے مشہور قاضی فقیہ حنفی ہیں۔ وہ ابن خزیمہ اور ان کے طبقے والوں سے روایت بیان کرتے ہیں۔

پنجم: ابوسعید البستی شافعی ہیں۔ انھوں نے شیخ ابوحاتم الاسفرائنی سے علم لیا اور اندلس میں داخل ہوئے۔[1]

قسم دوم: احمد بن جعفر بن حمدان چار ہیں:

(۱) القَطیعی (۲) البصری (۳) الدِّینُوری (۴) الطَّرسُوسی

محمد بن یعقوب بن یوسف دو ہیں۔ دونوں نیشاپوری (شافعی) ہیں:

---

(۱) علی بن حسن الحلبی کہتے ہیں کہ وہ سابقہ (قاضی) ہی ہیں۔ (دیکھئے حاشیہ اختصار علوم الحدیث ۲/۶۲۸)

اس طرح کے دوسرے راوی بھی ہیں جن کا نام خلیل بن احمد ہے۔

ابوالعباس الاصم اور ابوعبداللہ ابن الاخرم

سوم: ابوعمران الجونی دو ہیں: عبدالملک بن حبیب تابعی اور موسیٰ بن سہل جو ہشام بن عروہ سے روایت بیان کرتے ہیں۔

ابوبکر بن عیاش تین ہیں:

(۱) مشہور قاری

(۲) ''غریب الحدیث'' کے مصنف السُّلَمی الباجَدّ ائی جو دو سو چار (۲۰۴ھ) میں فوت ہوئے۔

(۳) اور تیسرے حمصی مجہول ہیں۔

چہارم: صالح بن ابی صالح چار ہیں:

پنجم: محمد بن عبداللہ الانصاری دو ہیں۔ایک بخاری کے استاذ اور (مشہور کتاب) ''جزء'' والے مشہور ہیں۔ دوسرے ضعیف ہیں جن کی کنیت ابوسلمہ ہے۔

یہ باب بھی بہت وسعت والا ہے، اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ یہ تجربے اور بعض اوقات کسی چیز کے معلوم ہو جانے سے پتا چلتا ہے۔

(۵۵) پچپنویں قسم: سابقہ دونوں اقسام سے مرکب ہے۔

خطیب بغدادی نے اس کے بارے میں کتاب ''تلخیص المتشابہ فی الرسم'' لکھی ہے۔[۱]

اس کی مثال موسیٰ بن عَلی ـــ عین کی زبر کے ساتھ ـــ ہیں جو کہ ایک جماعت کا نام ہے اور موسیٰ بن عُلَیّ ـــ عین کی پیش کے ساتھ ـــ مصری ہیں جو تابعین سے روایت کرتے تھے۔

اس میں سے اَلْمُخَرَّمی اور اَلْمَخْرَمی ہیں۔

---

(۱) نیز دیکھئے تالی تلخیص المتشابہ فی الرسم/ یہ دونوں مطبوع ہیں۔ مترجم

اسی میں سے ثور بن یزید الحمصی اور ثور بن زید الدّیلی الحجازی ہیں۔

ابوعمرو الشَّیبانی النحوی اسحاق بن مرار اور یحییٰ بن ابی عمرو السیبانی۔

مسلم کے استاد عَمرو بن زُرارہ النیسابوری اور ابوالقاسم البغوی کے استاد عمرو بن زرارہ الحدثی۔

(۵۶) چھپنویں قسم: سابقہ قسم کے علاوہ دوسری قسم

اس کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ ایسے مشابہ نام جن کا اپنا نام اور ولدیت یا نسبت ایک ہی ہوتی ہے لیکن عمر میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ یہ متقدّم ہے اور یہ متاخر ہے۔

مثلاً:

یزید بن الاسود خزاعی صحابی ہیں اور یزید بن الاسود الجُرشی (بڑے تابعی) ہیں جنھوں نے جاہلیت کا زمانہ پایا ہے اور شام میں سکونت پذیر تھے۔ یہ وہی ہے جن سے (امیر) معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے دعائے استسقاء کروائی تھی، رہے اسود بن یزید تو وہ (سیدنا) ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے شاگردوں میں سے (مشہور) تابعی ہیں۔

اوزاعی کے شاگرد اور امام احمد کے استاد ولید بن مسلم دمشقی ہیں اور ایک دوسرے (ولید بن مسلم) ہیں جو بصرے کے رہنے والے تھے۔

مسلم بن ولید بن رباح مدنی ہیں، اُن سے (عبدالعزیز بن محمد) الدراوردی وغیرہ (حدیث) بیان کرتے ہیں اور (امام) بخاری کو اپنی تاریخ میں وہم ہوا، انھوں نے ان کا نام ولید بن مسلم لکھ دیا۔ واللہ اعلم

میں (ابن کثیر) نے کہا: ہمارے شیخ حافظ المزی نے تہذیب الکمال میں پوری توجہ سے اس کا بیان کیا ہے۔ انھوں نے اچھے طریقے سے متقدمین ومتاخرین کے درمیان فرق بتادیا۔

میں نے اپنی کتاب ''التکمیل'' میں کئی اچھی چیزوں کا اُن پر اضافہ کیا ہے۔ واللہ اعلم

(۵۷) ستاونویں قسم: جو لوگ اپنے باپ کے علاوہ دوسروں کی طرف منسوب ہیں ان کی معرفت

ان کی کئی قسمیں ہیں:

اول: جو اپنی ماؤں کی طرف منسوب ہیں مثلاً عفراء (رضی اللہ عنہا) کے دو بیٹے معاذ اور معوذ، انھوں نے غزوۂ بدر کے موقع پر ابوجہل کو زخمی کر کے گرایا تھا۔ ان کی ماں عفراء بنت عبید ہیں اور ان کے والد حارث بن رفاعہ الانصاری ہیں۔ ان کا تیسرا بھائی ہے جسے عوذ یا عون یا عوف کہتے تھے۔ واللہ اعلم

بلال بن حمامۃ المؤذن، آپ کے والد کا نام رَباح ہے۔

ابن ام مکتوم الاعمٰی، یہ بھی مؤذن ہیں۔ آپ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر حاضری میں امامت کراتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ بن زائدہ یا عمرو بن قیس، وغیرہ ہے۔

عبداللہ بن اللُّتبِیَہ صحابی ہیں، آپ کو ابن الاُتبِیَہ بھی کہا جاتا ہے۔

سہیل بن بیضاء اور ان کے دو بھائی (صحابی ہیں۔) بیضاء کا نام دَعد ہے اور ان کے والد کا نام وہب ہے۔

شرحبیل بن حسنہ شام میں اُمرائے صحابہ میں سے ایک ہیں۔ حسنہ ان کی ماں کا نام ہے۔ ان کے والد عبداللہ بن مطاع الکندی ہیں۔

عبداللہ بن بُحَینہ: اُن کی ماں بحینہ ہیں اور والد مالک بن قِشب الاسدی ہیں۔

سعد ابن حَبْتَہ: حبتہ اُن کی ماں ہیں اور بُجَیر بن معاویہ باپ ہیں۔

تابعین اور بعد والوں میں محمد ابن الحَنَفِیَّہ، ان کی ماں کا نام خَولہ (اور لقب حنفیہ) ہے۔ ان کے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب ہیں۔

اسماعیل بن عُلَیَّہ: عُلَیہ اُن کی ماں ہے اور ابراہیم باپ ہیں، وہ حدیث وفقہ کے اماموں میں سے اور بہت نیک لوگوں میں سے ایک تھے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: رہا ابن عُلَیّہ جس کا ذکر بہت سے فقہاء کرتے ہیں، وہ اسماعیل بن علیہ کا بیٹا ابراہیم ہے۔ یہ شخص بدعتی تھا اور خلقِ قرآن کا قائل تھا۔

ابن ہراسہ: وہ ابو اسحاق ابراہیم بن ہراسہ ہے۔ حافظ عبدالغنی بن سعید المصری نے کہا: ہراسہ اُس کی ماں ہے اور سَلَمہ (قولِ راجح میں: رجاء) اس کا باپ ہے۔

ان لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی دادی نانی کی طرف منسوب ہیں مثلاً:

یعلی بن مُنیہ: زبیر بن بکار نے کہا: یہ ان کی دادی اُمیّہ ہیں۔

بشیر بن الخصاصِیہ: ان کے والد کا نام معبد ہے اور خصاصیہ اُن کے تیسرے دادا کی ماں تھی۔

شیخ ابو عمرو (ابن الصلاح) نے کہا: ہمارے قریب ترین زمانے میں ہمارے اُستاد ابو احمد عبدالوہاب بن علی البغدادی ابن سُکَینہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سُکَینہ اُن کی دادی تھیں۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: اسی طرح ہمارے استاد علامہ ابو العباس ابن تیمیہ کا نام احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن ابی القاسم بن محمد بن تیمیہ الحَرّانی ہے۔ تیمیہ آپ کے دُور کے پڑ دادوں میں سے کسی کی ماں تھیں۔

ان میں سے بعض اپنے دادا کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ جیسے نبی ﷺ نے غزوۂ حنین کے دن خچر پر سواری کے دوران میں اُسے (اسلام کے) دشمنوں کی طرف بھگاتے ہوئے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: میں نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا (یعنی پوتا) ہوں۔

آپ رسول اللہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ (ﷺ)

جیسے کہ ابو عبیدہ بن الجراح: عامر بن عبداللہ بن الجراح الفہری ہیں۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔ سب سے پہلے شام میں آپ کو امیر الامراء کہا گیا ہے۔ آپ کی امارت خالد بن ولید کے بعد ہوئی تھی۔ رضی اللہ عنہما

مجمع بن جاریہ: آپ مجمع بن یزید بن جاریہ ہیں۔

ابن جریج: آپ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہیں۔

ابن ابی ذئب: آپ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب ہیں۔

احمد بن حنبل: آپ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی ہیں۔آپ اماموں میں سے ایک تھے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ: آپ عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی ، (مشہور کتاب) مصنف (ابن ابی شیبہ) کے مصنف ہیں۔

اسی طرح آپ کے دو بھائی تھے: حافظ عثمان (بن ابی شیبہ) اور قاسم (بن ابی شیبہ)

ابوسعید بن یونس: ''تاریخ مصر'' کے مصنف ، آپ عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس بن عبدالاعلیٰ الصَّدَفی ہیں۔

جو لوگ اپنے والد کے علاوہ دوسروں کی طرف منسوب ہوئے ہیں اُن میں مقداد بن الاسود (رضی اللہ عنہ) ہیں۔آپ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ البہرانی ہیں۔اسود عبد یغوث الزہری کے بیٹے اور ان کی والدہ کے (دوسرے) شوہر تھے۔آپ ان کی گود میں بڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے آپ کو بیٹا بنالیا تھا تو آپ ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیے گئے۔

حسن بن دینار حقیقت میں حسن بن واصل ہیں۔دینار ان کا سوتیلا باپ تھا۔

ابن ابی حاتم نے کہا: حسن بن دینار بن واصل [1] (الجرح والتعدیل ۲/۱۱)

(۵۸) اٹھاونویں قسم: ایسا نسب جو ظاہر کے خلاف ہے۔

جیسے ابومسعود عقبہ بن عمرو البدری ہیں۔بخاری نے کہا: وہ بدر میں حاضر تھے۔ [2]

جمہور نے اُن کی مخالفت کی اور کہا: وہ بدر میں (گھر بنا کر) آباد ہوئے تھے اس وجہ سے آپ کو بدری کہا گیا ہے۔ [3]

(۱) یہ امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رحمہ اللہ کی غلطی ہے۔صحیح وہی بات ہے جو ابن کثیر وغیرہ نے لکھی ہے۔

(۲) دیکھئے صحیح البخاری (۴۰۰۷) (۳) امام بخاری کے علاوہ امام مسلم بھی انھیں بدری صحابی سمجھتے ہیں۔اس کی تائید اُس صحیح حدیث سے ہوتی ہے جس میں آیا ہے کہ ''وکان شھد بدراً'' اور وہ غزوۂ بدر میں حاضر تھے۔ دیکھئے صحیح بخاری (۴۰۰۷) اور کتاب الکنیٰ للامام مسلم (قلمی ص ۱۰۴) لہٰذا یہاں جمہور کا قول مرجوح ہے۔

سلیمان بن طرخان التیمی تیمیوں میں سے نہیں تھے۔ وہ اُن کے پاس صرف ٹھہرے تھے لہٰذا اس وجہ سے آپ کو تیمی کہا گیا۔ آپ بنو مُرہ کے مولیٰ تھے۔

ابو خالد الدالانی: دالان ہَمدان کی ایک شاخ ہے۔ وہ ان (بنو دالان) میں بھی رہے تھے ورنہ تو بنو اسد کے موالی میں سے تھے۔

ابراہیم بن یزید الخُوزی مکہ میں خُوز کی گھاٹی میں رہا تھا۔

عبدالملک بن ابی سلیمان العرزمی: یہ بنو فزارہ کی ایک شاخ ہے۔ وہ کوفہ میں اُن (عرزم) کے علاقے میں رہے تھے۔

محمد بن سِنان العَوَقی: عبدالقیس (قبیلے) کی ایک شاخ ہے۔ وہ باہلی ہیں لیکن بصرہ میں ان کے پاس رہے تھے۔

احمد بن یوسف السُّلَمی: مسلم کے استاد (اور) اَزدی ہیں لیکن وہ اپنی ماں کے قبیلے (سُلَم) کی طرف منسوب ہوگئے اور اسی طرح ان کے پوتے ابو عمرو اسماعیل بن نُجید السُّلَمی اور اُن (اسماعیل) کا نواسا ابوعبدالرحمٰن السُّلَمی الصوفی۔

اسی (باب) میں سے مِقْسَم کو مولیٰ ابن عباس کہا گیا ہے کیونکہ وہ عام طور پر ابن عباس کے پاس رہتے تھے ورنہ وہ عبداللہ بن الحارث بن نوفل کے مولیٰ تھے۔ خالد الحذاء کو اس لئے حذاء (موچی) کہا گیا ہے کہ وہ موچیوں کے پاس بیٹھے تھے یا بیٹھتے تھے۔

یزید الفقیر کی پیٹھ کی ہڈیوں میں درد تھا (ان ہڈیوں کو عربی میں فقار کہتے ہیں) تو اس وجہ سے انھیں فقیر کہا گیا۔

(۵۹) انسٹھویں قسم: مردوں اور عورتوں کے ناموں میں مبہم ناموں کی پہچان

اس کے بارے میں حافظ عبدالغنی بن سعید المصری نے (الغوامض والمبہمات) اور خطیب بغدادی نے (الاسماء المبہمہ فی الانباء المحکمہ) اور دوسروں نے کتابیں لکھیں۔

یہ بات حدیث کی سندیں جمع کرنے کے بعد دوسری روایت سے معلوم ہوتی ہے مثلاً:
ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج ہے؟
سوال کرنے والے یہ اقرع (بن حابس) ہیں۔ (رضی اللہ عنہ)
ابو سعید (الخدری رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ وہ لوگ ایک قبیلے کے پاس سے گزرے جس کے سردار کو کسی (زہریلی) چیز نے ڈس لیا تھا۔ پھر ایک آدمی نے اس کا علاج دم سے کیا۔ ایک آدمی سے مراد بذات خود ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ ہیں۔
اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا ذکر طوالت کا باعث ہے۔
ابن الاثیر نے اپنی کتاب ''جامع الاصول'' کے آخر میں اس پر توجہ دی ہے۔
شیخ محی الدین النووی نے اس بارے میں خطیب کی کتاب کو (الاشارات إلی بیان اسماء المبہمات کے نام سے) مختصر کیا ہے۔
حدیث کے حکم کی پہچان کے مقابلے میں یہ فن تھوڑے فائدے والا ہے لیکن اس کے باوجود بھی بہت سے محدثین (اس پر) توجہ دیتے ہیں۔
اس میں اہم بات یہ ہے کہ اگر سند میں کوئی ابہام ہو مثلاً ''عن فلان عن فلان'' یا ''عن أبیه''، ''عن عمه''، ''عن أمه'' وغیرہ پھر دوسری سند سے اس مبہم کا نام معلوم ہو جائے۔ اس کا ثقہ یا ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے یا یہ پتا چل جاتا ہے کہ اس کے (حالات کے) بارے میں تلاش جاری ہے۔ اس قسم میں یہی بات سب سے زیادہ مفید ہے۔

(٦٠) ساٹھویں قسم: راویوں کی پیدائش، وفات اور عمر کی پہچان

تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اُس نے کسے پایا ہے اور کسے نہیں پایا۔ وہ جھوٹا ہے یا مدلس ہے؟ اس طرح متصل اور منقطع وغیرہ کا پتا چل جاتا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: جب راویوں نے جھوٹ کا استعمال کیا تو ہم نے ان کے مقابلے میں تاریخ کا استعمال کیا۔ (۱)

حفص بن غیاث نے کہا: جب تم کسی شیخ کو متہم سمجھتے ہو تو سالوں سے اس کا محاسبہ کرو یعنی اس کی عمر کا حساب لگاؤ اور وہ جس سے روایت کر رہا ہے اُس کی عمر کا حساب لگاؤ۔ (۲)

حاکم نے کہا: جب محمد بن حاتم الکشی ہمارے پاس آیا تو اس نے عبد بن حمید سے حدیثیں بیان کیں۔ میں نے اس سے اس کی پیدائش کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ دوسو ساٹھ (٢٦٠ھ) میں پیدا ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: یہ شخص دعویٰ کر رہا ہے کہ اُس نے عبد بن حمید سے اُن کی وفات کے تیرہ سال بعد سُنا ہے۔! (۳)

ابن الصلاح نے کہا: صحابہ میں سے دو آدمی ایسے ہیں کہ انھوں نے ساٹھ سال جاہلیت کے اور ساٹھ سال اسلام کے پائے ہیں، وہ دونوں حکیم بن حزام اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما ہیں، دونوں کی عمر ایک سو بیس ایک سو بیس سال ہے۔

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ حسان بن ثابت بن منذر بن حزام میں سے ہر ایک

---

(۱) الکامل لابن عدی (۹۷/۱، دوسرا نسخہ ۱۶۹/۱) ومن طریقہ الخطیب فی الکفایہ (ص ۱۱۹) اس کی سند عبدالوہاب بن عصام بن الحکم کے مجہول الحال ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور باقی سند میں بھی نظر ہے۔

(۲) الکفایہ (ص ۱۹۳) اس کی سند اسحاق بن احمد بن علی بن ابراہیم بن قولویہ ابو یعقوب التاجر (متوفی ۳۶۸ھ) کے مجہول الحال ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(۳) المدخل الی الاکلیل للحاکم (ص ٦١) الجامع فی اخلاق الراوی وآداب السامع (۱۳۲/۱)

(حسان، ثابت، منذر اور حزام) کی عمر ایک سو بیس سال ہے۔

حافظ ابونعیم (الاصبہانی) نے کہا: عربوں میں اس طرح کی دوسری کوئی مثال نہیں ہے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: عربوں میں ایک جماعت کی اس سے زیادہ عمریں ہوئی ہیں۔ ابونعیم کا مطلب یہ ہے کہ پے در پے ترتیب وار ایک سو بیس (۱۲۰) سال زندہ رہنے والے دادا، بیٹا، پوتا اور پڑپوتا کوئی نہیں ہے۔

سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں عباس بن یزید البحرانی نے اجماع نقل کیا ہے کہ وہ دوسو پچاس (۲۵۰) سال زندہ رہے اور اس سے زیادہ پر اختلاف ہے کہ وہ کیا ساڑھے تین سو سال (۳۵۰) زندہ رہے یا نہیں؟[1]

شیخ ابوعمرو ابن الصلاح رحمہ اللہ نے مشہور لوگوں کی وفاتیں (یہاں) ذکر کی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشہور قول کے مطابق تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں پیر کے دن بارہ (۱۲) ربیع الاول کو گیارہ ہجری (۱۱ھ) میں فوت ہوئے۔

ابوبکر (الصدیق) تریسٹھ سال کی عمر میں جماوی کے مہینے میں تیرہ ہجری (۱۳ھ) کو فوت ہوئے۔

عمر (بن الخطاب) تریسٹھ سال کی عمر میں ذوالحجہ تیئیس (۲۳ھ) کو شہید ہوئے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ ہجرت والی اسلامی تاریخ سب سے پہلے (سیدنا) عمر نے جاری فرمائی جیسا کہ ہم نے اُن کی سیرت (والی کتاب) اور تاریخ والی کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے۔[2]

انھوں نے سولہ ہجری (۱۶ھ) میں یہ حکم جاری فرمایا تھا۔

عثمان بن عفان کی شہادت کے وقت اسی (۸۰) یا ایک قول میں نوے (۹۰) سال عمر

---

(۱) حافظ ذہبی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ شاید سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) ستر سال سے اوپر زندہ رہے، سو تک نہیں پہنچے۔ دیکھئے سیر اعلام النبلاء (۱/۵۵۶، ۵۵۷)

(۲) دیکھئے البدایہ والنہایہ (۲۰۶/۳، دوسرا نسخہ ج ۳ ص ۲۷۸)

تھی۔آپ ذوالحجہ کے مہینے میں پینتیس ہجری (۳۵ھ) کو شہید ہوئے۔

علی (بن ابی طالب) رمضان میں -ایک قول کے مطابق تریسٹھ سال کی عمر میں- چالیس ہجری کو شہید ہوئے۔

طلحہ (بن عبید اللہ) اور زبیر (بن العوام) جنگِ جمل کے موقع پر چھتیس ہجری کو شہید ہوئے۔حاکم نے کہا: شہادت کے وقت دونوں کی عمر چونسٹھ چونسٹھ سال تھی۔

سعد (بن ابی وقاص) تہتر (۷۳) سال کی عمر میں پچپن (۵۵ھ) کو فوت ہوئے۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سب سے آخری فوت ہونے والے تھے۔

سعید بن زید تہتر یا چوہتر سال کی عمر میں اکاون (۵۱ھ) کو فوت ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن عوف پچھتر سال کی عمر میں بتیس (۳۲ھ) کو فوت ہوئے۔

ابوعبیدہ (بن الجراح) اٹھاون سال کی عمر میں اٹھارہ (۱۸ھ) کو فوت ہوئے۔

اللہ ان سب سے راضی ہو۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: عَبادلہ میں عبداللہ بن عباس اڑسٹھ (۶۸ھ) ابن عمر اور ابن زبیر تہتر (۷۳ھ) اور عبداللہ بن عمرو (بن العاص) سڑسٹھ (۶۷ھ) کو فوت ہوئے۔

احمد بن حنبل کے نزدیک عبداللہ بن مسعود عبادلہ میں سے نہیں ہیں جبکہ جوہری کے نزدیک عبادلہ میں سے ہیں۔آپ کی وفات اکتیس (۳۱ھ) کو ہوئی تھی۔

ابن الصلاح نے کہا:

سوم: مذاہبِ خمسہ والے ائمہ جن کی اتباع (بالدلیل) کی جاتی ہے (ان کی وفات درج ذیل ہیں):

سفیان الثوری بصرہ میں چونسٹھ (۶۴) سال کی عمر میں ایک سو اکسٹھ (۱۶۱ھ) کو فوت ہوئے۔

مالک بن انس مدینہ میں ایک سو اُناسی (۱۷۹ھ) کو فوت ہوئے۔آپ کی عمر اَسی (۸۰) سے متجاوز تھی۔

ابوحنیفہ بغداد میں ستر سال (۷۰) کی عمر میں ایک سو پچاس (۱۵۰ھ) کو فوت ہوئے۔

محمد بن ادریس الشافعی مصر میں چون (۵۴) سال کی عمر میں دوسو چار (۲۰۴ھ) کو فوت ہوئے۔

احمد بن حنبل بغداد میں ستتر (۷۷) سال کی عمر میں دوسو اکتالیس (۲۴۱ھ) کو فوت ہوئے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: شام والے دوسو سال تک اوزاعی کے مذہب (طریقۂ استدلال) پر تھے۔

وہ ساٹھ سال سے اوپر، شام کے ساحل بیروت میں ایک سو ستاون (۱۵۷ھ) میں فوت ہوئے۔ اسی طرح اسحاق بن راہو یہ امام تھے ان کی اتباع کی جاتی تھی۔ ایک گروہ اُن کی تقلید کرتا تھا اور ان کے مسلک پر چلنے میں اجتہاد کرتا تھا، انھیں اسحاقیہ کہتے ہیں۔ آپ کی وفات ستر سال سے اوپر عمر میں دوسو اڑتیں (۲۳۸ھ) میں ہوئی۔ (۱)

ابن الصلاح نے کہا:

چہارم: پانچ کتبِ حدیث کے مصنفین:

بخاری ایک سو چورانوے (۱۹۴ھ) میں پیدا ہوئے اور عید الفطر کی رات خرتنگ گاؤں میں دوسو چھپن (۲۵۶ھ) کو فوت ہوئے۔

مسلم بن الحجاج پچپن سال کی عمر میں دوسو اکسٹھ (۲۶۱ھ) کو فوت ہوئے۔ (۲)

ابوداود دوسو پچھتر (۲۷۵ھ) کو فوت ہوئے۔

ترمذی اُن کے چار سال بعد دوسو اُناسی (۲۷۹ھ) کو فوت ہوئے۔

ابوعبدالرحمٰن النسائی تین سو تین (۳۰۳ھ) میں فوت ہوئے۔

---

(۱) دینِ اسلام میں اتباع بالدلیل تو صحیح ہے لیکن اتباع بغیر دلیل یعنی تقلید جائز نہیں ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے دین میں لوگوں کی تقلید نہ کرو۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر عالم سیدھے راستے پر بھی ہو تو دین میں اس کی تقلید نہ کرو۔ دیکھئے میری کتاب: دین میں تقلید کا مسئلہ (ص ۳۵، ۳۶)

(۲) رجب کے پانچ دن باقی تھے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی، سنن ابن ماجہ کے مصنف۔ جس کے ساتھ کتبِ ستہ مکمل ہو گئیں اور صحیحین کے بعد سنن اربعہ کا اتمام ہوا، جن کے اطراف حافظ ابن عساکر نے مرتب کئے اور اسی طرح ہمارے شیخ حافظ مزی نے اس (کتاب) کے راویوں اور اطراف پر توجہ دی۔ یہ کتاب (سنن ابن ماجہ) مفید ہے۔ اس کی فقہی تبویب مضبوط ہے۔

آپ دوسو تہتر (۲۷۳ھ) کو فوت ہوئے۔ رحمہم اللہ

(ابن الصلاح) نے کہا:

پنجم: سات حفاظِ حدیث جن کی کتابوں سے ہمارے زمانے میں فائدہ اُٹھایا گیا:

ابوالحسن الدارقطنی اُناسی سال کی عمر میں (ذوالقعدہ میں بغداد میں) تین سو پچاسی (۳۸۵ھ) کو فوت ہوئے۔

ابو عبداللہ الحاکم النیسابوری صفر میں چار سو پانچ (۴۰۵ھ) کو اسی سال سے زیادہ کی عمر میں فوت ہوئے۔ عبدالغنی بن سعید المصری ستتر سال کی عمر میں صفر چار سو نو (۴۰۹ھ) کو مصر میں فوت ہوئے۔

حافظ ابو نعیم الاصبہانی چھیانوے سال کی عمر میں چار سو تیس (۴۳۰ھ) کو فوت ہوئے۔

دوسرے طبقے میں شیخ ابو عمر (بن عبدالبر) النمری پچانوے سال کی عمر میں چار سو تریسٹھ (۴۶۳ھ) کو فوت ہوئے۔

پھر ابو بکر احمد بن الحسین البیہقی نیشاپور میں چوہتر سال کی عمر میں چار سو اٹھاون (۴۵۸ھ) کو فوت ہوئے۔

پھر ابو بکر احمد بن علی الخطیب البغدادی اکہتر سال کی عمر میں چار سو تریسٹھ (۴۶۳ھ) کو فوت ہوئے۔

میں (ابن کثیر) نے کہا: ان لوگوں کے ساتھ انھیں بھی ذکر کرنا چاہئے تھا جن کی کتابیں لوگوں میں اور خاص طور پر اہل حدیث کے نزدیک (بہت) مشہور ہیں مثلاً:

المعجم الکبیر، المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر وغیرہ کتابوں کے مصنف طبرانی تین سو ساٹھ (۳۶۰ھ) میں فوت ہوئے۔

حافظ ابو یعلیٰ الموصلی [تین سو سات (۳۰۷ھ) میں فوت ہوئے۔]

حافظ ابو بکر البزار [دو سو بانوے (۲۹۲ھ) میں فوت ہوئے۔]

اور امام الائمہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ، صحیح ابن خزیمہ کے مصنف تین سو گیارہ (۳۱۱ھ) میں فوت ہوئے۔

اسی طرح صحیح ابن حبان کے مصنف ابو حاتم محمد بن حِبّان البُستی تین سو چون (۳۵۴ھ) میں فوت ہوئے۔

اور کامل ابن عدی کے مصنف حافظ ابو احمد بن عدی تین سو سڑسٹھ (۳۶۷ھ) میں فوت ہوئے۔

(۶۱) اکسٹھویں قسم: راویوں میں سے ثقہ اور ضعیف راویوں کی پہچان

علومِ حدیث میں یہ فن سب سے اہم، اعلیٰ اور مفید ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے حدیث کی سند کا صحیح اور ضعیف ہونا معلوم ہوتا ہے۔

لوگوں نے قدیم اور جدید زمانے میں اس علم پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مفید (عبدالرحمٰن) ابن ابی حاتم (الرازی) کی کتاب (الجرح والتعدیل) ہے۔

ابن حبان کی دو کتابیں (۱) ایک کتاب الثقات اور دوسری (۲) کتاب الضعفاء (المجروحین) مفید کتابیں ہیں۔

اور ابن عدی کی کتاب کتاب الکامل (بھی مفید ہے۔)

تاریخ کی کئی کتابیں مشہور ہیں جن میں حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیب کی تاریخ بغداد، حافظ ابوالقاسم بن عساکر کی تاریخ دمشق، ہمارے شیخ حافظ ابوالحجاج المزی کی تہذیب الکمال اور ہمارے شیخ حافظ ابو عبداللہ الذہبی کی میزان الاعتدال بہت جلیل القدر کتابیں ہیں۔

میں نے ان دونوں کتابوں (تہذیب الکمال اور میزان الاعتدال) کو اکٹھا کر دیا ہے اور

جرح وتعدیل میں ان پر اضافے کیے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب کا نام "التکمیل فی معرفة الثقات والضعفاء والمجاهیل" رکھا ہے۔ یہ کتاب ماہر فقیہ اور اسی طرح محدّث کے لئے (یکساں) بہت مفید ہے۔

اگر راویوں پر جرح کا مقصد اللہ، رسول، قرآن مجید اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہو تو یہ غیبت میں سے نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والے کو اس کے بہترین مقصد کی وجہ سے ثواب ملے گا۔

یحییٰ بن سعید القطان سے کہا گیا: کیا آپ کو اس کا خوف نہیں ہے کہ جن لوگوں کی آپ نے حدیث ترک کر دی ہے وہ قیامت کے دن آپ کے دشمن ہوں گے؟

انھوں نے جواب دیا: اگر یہ لوگ میرے دشمن بن گئے تو میرے نزدیک یہ اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے دشمن بن جائیں۔[۱]

ابوتُراب (عسکر بن الحصین) النَّخْشَبِی نے احمد بن حنبل کو بعض راویوں پر جرح کرتے ہوئے سُنا تو کہا: کیا آپ علماء کی غیبت کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: **ویحك!** یہ نصیحت ہے، یہ غیبت نہیں ہے۔[۲]

کہا جاتا ہے کہ راویوں پر سب سے پہلے (امام) شعبہ بن الحجاج نے باقاعدہ کلام شروع کیا۔ یحییٰ بن سعید القطان نے اُن کی پیروی کی پھر ان کے شاگردوں احمد بن حنبل، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین اور عمرو بن علی الفلاس وغیرہم نے (ان کی اتباع میں) یہ علم استعمال کیا۔

اس علم میں مالک (بن انس)، ہشام بن عروہ اور سلف صالحین کی ایک جماعت نے کلام کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے۔ (صحیح مسلم:۵۵)

بعض لوگوں نے بعض لوگوں پر جرح کی ہے مگر اسے معتبر نہیں سمجھا گیا کیونکہ اس جرح کی بنیاد مشہور دشمنی پر تھی۔

---

(۱) دیکھئے الکامل لابن عدی (۱۰۷/۱) الکفایہ (ص ۴۴) اس کی سند حسن ہے۔

(۲) الکفایہ (ص ۴۴) اس کی سند احمد بن مروان المالکی الدینوری کی وجہ سے سخت ضعیف ہے۔

اس کی مثالوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ محمد بن اسحاق (بن یسار) کی امام مالک پر اور امام مالک کی محمد بن اسحاق پر جرح (مقبول نہیں) ہے۔ سہیلی نے (الروض الانف ۱/۶ میں) اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اور اسی طرح نسائی کی احمد بن صالح المصری پر جرح (مردود) ہے، جب احمد بن صالح نے انھیں اپنی مجلس میں حاضر ہونے سے منع کر دیا تھا۔

(۶۲) باسٹھویں قسم: ان راویوں کی پہچان جو آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔

خوف، تکلیف، مرض یا کسی خاص حادثے کی وجہ سے راویوں کو اختلاط ہو مثلاً جب عبداللہ بن لہیعہ کی کتابیں ضائع ہو گئیں تو وہ حافظے میں اختلاط کا شکار ہو گئے۔

ایسے لوگوں سے جس نے اختلاط سے پہلے سُنا ہے وہ روایت مقبول ہے اور جس نے بعد میں سُنا ہے یا شک ہے (کہ یہ اختلاط سے پہلے یا بعد کی روایت ہے؟) تو ان کی روایات مقبول نہیں ہیں۔

جو لوگ آخر میں اختلاط کا شکار ہو گئے ان میں سے بعض (کے نام) درج ذیل ہیں:

عطاء بن السائب[1]

ابو اسحاق السبیعی[2]، حافظ ابو یعلیٰ الخلیلی نے کہا: ابن عیینہ نے اُن سے اُن کے اختلاط کے بعد سُنا ہے۔ (الارشاد ۱/۳۵۵)

---

(۱) آپ سے شعبہ، سفیان ثوری، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ہمام بن یحییٰ، ہشام الدستوائی، سفیان بن عیینہ، ایوب السختیانی، زہیر، زائدہ بن قدامہ اور اعمش نے اختلاط سے پہلے سنا تھا۔
دیکھئے الکواکب النیرات (ص ۳۱۹-۳۳۴)

(۲) آپ سے شعبہ، سفیان ثوری، قتادہ اور شریک بن عبداللہ القاضی نے اختلاط سے پہلے سنا تھا۔ دیکھئے حاشیۃ الکواکب النیرات (ص ۳۵۶) صحیحین میں آپ سے اسرائیل بن یونس وغیرہ کی روایتیں موجود ہیں جو کہ صحیح ہیں۔

سعید بن ابی عروبہ[1]: وکیع اور معافیٰ بن عمران کا ان سے سماع اختلاط کے بعد ہے۔

مسعودی[2]، ربیعہ[3] اور صالح مولی التوأمہ[4]

حصین بن عبدالرحمٰن[5]: نسائی نے کہا ہے (کہ اختلاط کا شکار ہوئے تھے۔)

سفیان بن عیینہ اپنی وفات سے دو سال پہلے مختلط ہوئے تھے، یہ بات یحییٰ القطان نے بتائی ہے۔[6]

---

(۱) ابونعیم الفضل بن دکین، وکیع، معافی بن عمران، محمد بن جعفر غندر، محمد بن عبداللہ الانصاری، محمد بن ابی عدی، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عمرو بن الہیثم نے ان کے اختلاط کے بعد سنا۔ یزید بن ہارون، ابن المبارک، یحییٰ القطان اور خالد بن الحارث وغیرہم نے اختلاط سے پہلے سنا۔ دیکھئے ہامش الکواکب النیرات (ص ۲۰۸، ۲۰۹)

(۲) آپ سے وکیع، ابونعیم، امیہ بن خالد، بشر بن المفضل، جعفر بن عون، خالد بن الحارث، سفیان بن حبیب، سفیان ثوری، ابوقتیبہ سلم بن قتیبہ، طلق بن غنام، عبداللہ بن رجاء، عثمان بن عمر، عمرو بن مرزوق، عمرو بن الہیثم، قاسم بن معن، معاذ بن معاذ، نضر بن شمیل، یزید بن زریع، شعبہ اور یحییٰ بن سعید نے اختلاط سے پہلے سنا ہے۔ دیکھئے الکواکب النیرات (ص ۲۸۲۔۲۹۸)

(۳) ان پر اختلاط کا الزام صحیح نہیں ہے لہٰذا ہر ثقہ وصدوق راوی کی اُن سے روایت صحیح و حسن ہے۔

(۴) آپ سے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب، عبدالملک بن جریج، زیاد بن سعد، اسید بن ابی اسید، سعید بن ایوب، عبداللہ بن علی الافریقی، عمارہ بن غزیہ اور موسیٰ بن عقبہ نے اختلاط سے پہلے سنا تھا۔ دیکھئے الکواکب النیرات (ص ۲۵۸۔۲۶۵)

(۵) آپ سے سلیمان التیمی، سلیمان الاعمش، شعبہ، سفیان ثوری، ہشیم بن بشیر، زائدہ بن قدامہ، خالد الواسطی عباد بن العوام، سلیمان بن کثیر اور شعیب بن میمون نے اختلاط سے پہلے سنا ہے۔ (دیکھئے الکواکب النیرات مع الہامش ص ۱۴۰) ابوعوانہ، ابوبکر بن عیاش، ابوکدینہ، عبثر بن القاسم، عبدالعزیز العمی، عبدالعزیز بن مسلم اور محمد بن فضیل کا آپ سے سماع بھی قبل از اختلاط ہے۔

(۶) صرف محمد بن عاصم اور الیسع بن سہل نے آپ کے اختلاط کے بعد سنا ہے اور ان کے علاوہ تمام لوگوں نے آپ کے اختلاط سے پہلے سنا۔ دیکھئے ہامش الکواکب (ص ۲۳۳، ۲۳۴)

عبدالوہاب الثقفی[۱]، یہ بات ابن معین نے بتائی ہے۔

عبدالرزاق بن ہمام[۲]: احمد بن حنبل نے کہا: وہ نابینا ہونے کے بعد اختلاط کا شکار ہو گئے تھے پھر تلقین قبول کر لیتے تھے پس جس نے ان کے نابینا ہونے کے بعد سُنا ہے وہ کچھ چیز نہیں ہے۔

ابن الصلاح نے کہا: میں نے پایا ہے کہ طبرانی نے اسحاق بن ابراہیم الدَّبَری عن عبدالرزاق کی سند سے منکر حدیثیں بیان کی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس (دبری) کا عبدالرزاق سے سماع بعد از اختلاط ہو۔ ابراہیم الحربی نے بتایا ہے کہ جب عبدالرزاق فوت ہوئے تو اس وقت دَبری کی عمر چھ یا سات سال تھی۔

(محمد بن الفضل السدوسی) عارم آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہوئے۔[۳]

ان کے بعد درج ذیل کو اختلاط ہوا ہے۔

ابو قلابہ الرقاشی[۴]

---

(۱) آپ نے اختلاط کے بعد کوئی روایت بیان نہیں کی لہٰذا آپ کا اختلاط مضر نہیں ہے۔
دیکھئے الکواکب (ص ۳۱۷)

(۲) آپ سے اختلاط کے بعد اسحاق بن ابراہیم الدبری، احمد بن محمد عرف ابوالحسن بن شبویہ، محمد بن حماد الطہرانی، ابراہیم بن محمد بن براء الصنعانی، ابراہیم بن محمد بن عبداللہ بن سوید، الحسن بن عبدالاعلیٰ الصنعانی اور ابراہیم بن منصور الرمادی نے اختلاط کے بعد سنا۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین اور کتب ستہ کے شیوخ نے اختلاط سے پہلے سنا۔ دیکھئے الکواکب النیرات (ص ۲۷۴۔۲۸۱)

(۳) آپ نے اختلاط کے بعد کوئی حدیث بیان نہیں کی۔ دیکھئے الکاشف للذہبی (۷۹/۳) لہٰذا آپ کا اختلاط مضر نہیں ہے۔

(۴) عبدالملک بن محمد بن عبداللہ الرقاشی: جمہور کی توثیق کی وجہ سے حسن الحدیث راوی ہیں۔ ابن خزیمہ، ابوداود، ابن ماجہ، ابومسلم، ابوبکر بن ابی داود، محمد بن اسحاق الصغانی، احمد بن یحییٰ البلاذری اور ابوعروبہ نے اُن کے اختلاط سے پہلے سنا تھا۔ جنھوں نے اُن سے بصرہ میں سنا تھا وہ بھی قبل از اختلاط ہے۔ دیکھئے الکواکب (ص ۳۰۹)

ابو احمد الغطر یفی [1] اور ابو بکر ابن مالک القطیعی [2]: بہت بوڑھے ہو کر سٹھیا گئے حتی کہ انھیں یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ انھیں کیا سُنایا جا رہا ہے۔

(۶۳) تریسٹھویں قسم: طبقات کی پہچان

یہ اصطلاحی امر ہے۔ بعض لوگ تمام صحابہ کو ایک طبقہ سمجھتے ہیں پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ تابعین ہیں پھر ان کے بعد تیسرا طبقہ (تبع تابعین) ہیں۔ الخ

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو اُن کے نزدیک ہیں پھر جو اُن کے نزدیک ہیں۔

آپ نے اپنے زمانے کے بعد دو یا تین زمانے ذکر کیے۔ [3]

بعض لوگ صحابہ کے کئی طبقات بناتے ہیں اور اسی طرح تابعین اور ان کے بعد والوں کے طبقات مقرر کرتے ہیں۔

بعض لوگ چالیس سال کو ہر قرن (زمانہ) قرار دیتے ہیں۔

اس کے بارے میں سب سے بہترین کتاب محمد بن سعد کاتب الواقدی کی الطبقات ہے اور اسی طرح ہمارے استاد علامہ ابو عبداللہ الذہبی کی کتاب التاریخ (تاریخ الاسلام) ہے۔

آپ کی کتاب ''طبقات الحفاظ'' (تذکرۃ الحفاظ) بہت زیادہ مفید ہے۔

---

(۱) محمد بن احمد بن الحسین القاسم الغطر یفی الجرجانی الرباطی کا اختلاط آخری دور میں ہوا تھا۔ اُن کی صرف ایک روایت پر کلام کیا گیا ہے: حدیث مالك عن الزهري عن أنس ان النبي ﷺ أهدى جملًا لأبي جهل . بعض نے اُن کے مسند اسحاق بن راہویہ کے سماع میں بھی کلام کیا ہے۔ اُن کی باقی تمام روایتیں مستقیم (صحیح) ہیں۔

(۲) آپ سے دارقطنی، ابن شاہین، حاکم، برقانی، ابو نعیم الاصبہانی اور ابو علی بن المذہب نے اختلاط سے پہلے سنا ہے۔ دیکھئے میری کتاب: علمی مقالات (ج ۱ ص ۳۹۶)

(۳) تین زمانے (صحیح بخاری: ۲۶۵۲، صحیح مسلم: ۲۵۳۳) چار زمانے (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۲/۱۷۶ ح ۳۲۴۰۰، دوسرا نسخہ ۳۲۹۵۰ وسندہ صحیح، صحیح ابن حبان [الاحسان]: ۷۱۸۵/۷۲۲۹)

(۶۴) چونسٹھویں قسم: راویوں اور علماء میں سے موالی کی پہچان

یہ اہم قسموں میں سے ہے۔

بعض اوقات کوئی شخص ایک قبیلے کی طرف منسوب ہو جاتا ہے اور سننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قبیلے کا ایک فرد ہے حالانکہ وہ ان کے آزاد کردہ غلاموں (موالی) میں سے ہوتا ہے لہٰذا اُس کی تمیز ہونی چاہئے تاکہ (صحیح بات) معلوم ہو جائے۔

اگرچہ حدیث میں آیا ہے کہ ''کسی قوم کا مولیٰ انھیں میں سے ہوتا ہے۔'' (صحیح البخاری: ۶۳۸۰)

اور اسی میں سے ابوالبختری الطائی سعید بن فیروز ہیں۔ وہ طے قبیلے کے موالی میں سے تھے۔

اسی طرح ابوالعالیہ الریاحی

اور لیث بن سعد الفہمی

اور عبداللہ بن وہب القرشی، وہ قریش کے موالی میں سے ہیں۔

عبداللہ بن صالح کاتب اللیث جُہَینہ کے مولیٰ ہیں۔[1]

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں۔

(امام) بخاری کے حالات میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ آپ جعفی قبیلے کے مولیٰ ہیں تو یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کے پڑدادا بعض جعفی قبیلے والوں کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔

اسی طرح حسن بن عیسیٰ الماسرجسی عبداللہ بن المبارک کے رشتۂ ولایت کی طرف منسوب ہیں کیونکہ وہ عیسائیوں میں سے تھے اور ابن المبارک کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔

بعض ولایت حلیف ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ امام مالک بن انس کے نسب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیمیوں کے مولیٰ ہیں حالانکہ وہ صُلبی (اصل) لحاظ سے حِمیَری

(۱) اختصار علوم الحدیث کی اصل عبارت یہ ہے: ''وکذلک عبداللہ بن وھب القرشي وھو مولی لعبد اللہ ابن صالح کاتب اللیث'' اور یہ عبارت غلط ہے۔

اَصبحی ہیں لیکن ان کے دادا مالک بن ابی عامر تیمیوں کے حلیف تھے۔ وہ طلحہ بن عبیداللہ التیمی کے پاس ملازمت کرتے تھے تو اس وجہ سے وہ تیمیوں کی طرف منسوب ہو گئے۔

زمانۂ سلف میں بڑے علماء کی ایک جماعت موالی میں سے تھی۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ جب حج یا عمرہ کے لئے جاتے ہوئے راستے میں عمر بن الخطاب کو نائبِ مکہ ملا تو انھوں نے اُس سے پوچھا: وادی والوں پر تُو نے کسے نائب مقرر کیا ہے؟ اس نے کہا: ابن اَبزیٰ، انھوں نے پوچھا ابن ابزیٰ کون ہے؟

اس نے کہا: موالی میں سے ایک آدمی ہے۔

آپ نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ اس علم کے ساتھ ایک قوم کو بلند کرے گا اور دوسروں کو گرا دے گا۔'' (ح ۸۱۷)

(روایت ہے کہ) زہری نے بیان کیا کہ ہشام بن عبدالملک (الاموی/خلیفہ) نے اُن سے پوچھا: مکہ والوں کا (علم میں) کون سردار ہے؟ میں نے کہا: عطاء (بن ابی رباح)

اس نے پوچھا: یمن والوں کا قائد کون ہے؟ میں نے کہا طاؤس

اس نے پوچھا: شام والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: مکحول

اس نے پوچھا: مصر والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: یزید بن ابی حبیب

اس نے پوچھا: جزیرے والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: میمون بن مہران

اس نے پوچھا: خراسان والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: ضحاک بن مزاحم

اس نے پوچھا: بصرے والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: حسن بن ابی حسن (البصری)

اس نے پوچھا: کوفے والوں کا کون ہے؟ میں نے کہا: ابراہیم نخعی

انھوں نے بیان کیا کہ ہر آدمی کے بارے میں وہ پوچھتا تھا: ''عربوں میں سے ہے یا موالی سے''؟

زہری فرماتے تھے: موالی میں سے۔

جب آخر تک پہنچے تو اس نے کہا: اے زہری! اللہ کی قسم عربوں کے موالی سردار اور قائد

بن جائیں گے۔حتی کہ منبروں پر اُن کا خطبہ ہوگا اور عرب نیچے بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

میں (زہری) نے کہا: اے امیر المومنین! یہ اللہ کا حکم اور دین ہے۔جس نے اسے یاد رکھا وہ قائد بن گیا اور جس نے اسے ضائع کیا تو وہ گر گیا۔(۱)

میں (ابن کثیر) نے کہا:

بعض اعرابیوں نے بصرے والے کسی آدمی سے پوچھا: اس شہر کا کون سردار ہے؟

اس نے کہا: حسن بن ابی حسن البصری۔اس نے پوچھا: کیا وہ مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ہے؟

کہا: جی ہاں۔اس نے پوچھا: یہ کس وجہ سے سردار بن گئے؟ اس نے کہا: وہ لوگ ان کے علم کے محتاج ہیں اور وہ اُن کی دنیا کے محتاج نہیں ہیں۔

اعرابی نے کہا: قسم ہے یہی سرداری ہے۔(۲)

(۶۵) پینسٹھویں (اور آخری) قسم: راویوں کے وطن اور علاقوں کی پہچان

بہت سے علمائے حدیث اس پر توجہ دیتے ہیں اور بعض اوقات اس سے اہم فائدے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

راوی کے استاذ کی معرفت، بعض اوقات یہ دوسرے سے مشتبہ ہو جاتا ہے پس جب ہم اس کا علاقہ معلوم کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا تعین ہو جاتا ہے اور یہ بہت ہی اہم جلیل القدر (کام) ہے۔عرب لوگ قبیلوں، قبیلوں کی شاخوں، خاندانوں اور گھروں کی طرف

(۱) معرفۃ علوم الحدیث (ص۲۴۵، ۲۴۶) اس کا راوی ولید بن محمد المُوَقّری متروک ہے لہٰذا یہ سارا قصہ باطل اور مردود ہے۔حافظ ذہبی نے کہا: ''الحکایة منکرة و الولید واہٍ'' یہ حکایت منکر ہے اور ولید سخت ضعیف راوی ہے۔(سیر اعلام النبلا ۵/۸۵)

(۲) یہ قصہ بے سند اور مردود ہے۔

منسوب کئے جاتے تھے جبکہ عجمی لوگ قوموں، گاؤں اور علاقوں کی طرف منسوب ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل اسباط (اولادِ یعقوب) کی طرف منسوب ہوئے تھے پھر جب اسلام آگیا اور لوگ ملکوں میں منتشر ہو گئے تو انھی مُلکوں، شہروں اور گاؤں کی طرف منسوب کئے گئے۔

جو شخص کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اسے اختیار تھا کہ اس گاؤں کی طرف منسوب ہو یا اگر چاہے تو شہر یا مُلک کی طرف منسوب ہو۔

اگر کوئی شخص ایک علاقے کا رہنے والا تھا پھر وہاں سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا تو اسے اختیار تھا کہ جس کی طرف چاہے منسوب ہو۔ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں کا ذکر کر دیا جائے مثلاً کہے: شامی پھر عراقی یا دمشقی پھر مصری وغیرہ۔

بعض نے کہا: ''جب کسی علاقے میں چار سال یا زیادہ رہے تو پھر اس علاقے سے انتساب صحیح ہے۔'' اور اس میں نظر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ کیا صحیح ہے۔

یہ آخری الفاظ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ''اختصار علوم الحدیث'' کے لکھے جانے میں آسانی بخشی ہے۔ حمد وثنا اور احسان اللہ ہی کے لئے ہے۔

وصلى الله على سيدنا محمد و آله و صحبه و سلم .

❁❁❁

[ترجمہ ختم شد (٦ جمادی الثانیہ ١٤٢٧ھ بروز پیر بمطابق ٣ جولائی ٢٠٠٦ء)

حجرہ حافظ شیر محمد بن غلام خالق بن فضل مولیٰ

باجوڑئی، بیاڑ، کوہستان تحصیل کلکوٹ ضلع دیر بالا

والحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله الأمين

حافظ زبیر علی زئی]

اصولِ حدیث کی عظیم و مشہور کتاب
اِختصار علوم الحدیث
تالیف
ابو الفدا اسمٰعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی
المتوفی ۷۷۴ھ
ترجمہ، تحقیق وحواشی
حافظ زبیر علی زئی
مکتبہ اسلامیہ